ماہنامہ میثاق کے ۶۸-۱۹۶۷ء کے اداریوں پر مشتمل

# ڈاکٹر اسرار احمد

کی ایک اہم تالیف:

# اسلام اور پاکستان

جس میں برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی تاریخ کا پس منظر اور
اسلامیان پاکستان کے ماضی، حال اور مستقبل پر ایک جامع و مدلل
دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

---

نیا ایڈیشن نئی خوبصورت کتابت اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

---

قیمت: اعلیٰ ایڈیشن ۔ ۲۴ روپے　　اشاعت عام: ۔ ۱۵ روپے

شائع کردہ
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن — ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

ماهنامه

# حکمتِ قرآن

لاهور


بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۲ | ذوالقعدہ ۱۴۱۳ھ / مئی ۱۹۹۳ء | شمارہ ۵

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۔ ۱۴ فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بکری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون: ۴۰/- روپے فی شمارہ: ۴/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

# ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور


بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے ایم فل پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۲ | ذوالقعدہ ۱۴۱۳ھ / مئی ۱۹۹۳ء | شمارہ ۵

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۔۱۴ فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بحری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون ۔/۴۰ روپے فی شمارہ ۔/۴ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اول

# سالانہ محاضراتِ قرآنی

مرکزی انجمن کے زیر اہتمام سالانہ محاضرات قرآنی حسبِ اعلان' ۲۲ تا ۲۷ اپریل منعقد ہوئے۔ اس بار محاضرات کے مرکزی مقرر' انجمن کے صدر مؤسس' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تھے اور موضوع تھا: "منہجِ انقلابِ نبوی"۔ انتہائی مخدوش اور ابتر ملکی سیاسی حالات کے پس منظر میں مسلسل پانچ روز ان محاضرات کا نہایت کامیابی سے انعقاد انتہائی حیران کن ہی نہیں حد درجہ حوصلہ افزا بھی تھا۔۔ بحمد اللہ پانچوں روز وسیع و کشادہ قرآن آڈیٹوریم کی نشستیں قریباً مکمل طور پر پر رہیں' بلکہ پہلے اور آخری روز حاضرین کی تعداد کے مقابلے میں آڈیٹوریم کی نشستیں ناکافی نظر آئیں۔ تاہم اس سے بھی زیادہ قابل اطمینان اور لائق شکر بات یہ ہے کہ یہ انتہائی اہم موضوع کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا فرمایا تو اس کا منہاج اور طریق کار کیا تھا اور یہ کہ دورِ حاضر میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے ہمیں سیرت و سنت سے کیا رہنمائی ملتی ہے' نہایت جامعیت کے ساتھ پانچ خطبات میں نہ صرف یہ کہ مکمل ہو گیا بلکہ ساتھ ہی اس ضمن میں مستفسرین کی جانب سے اٹھائے گئے سوالات اور اشکالات کی تسلی بخش وضاحت بھی ہو گئی اور اس طرح یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ بہت حد تک اس موضوع کا حق ادا ہو گیا۔ ان محاضرات کے آڈیو اور وڈیو کیسٹ تیار کر لئے گئے ہیں جن سے ان شاء اللہ اس فکر کے فروغ میں مدد ملے گی۔

ان محاضرات میں جن اصحاب علم و دانش کو بطور مستفسر مدعو کیا گیا تھا اور جن کے اسماء گرامی کی فہرست اُس ہینڈ بل میں شامل کی گئی تھی جو محاضرات کی اطلاع پر مشتمل تھا' وہ سب تو تشریف نہیں لا سکے تاہم بحیثیت مجموعی معاملہ مایوس کن بھی نہیں تھا۔ کم و بیش پانچ چھ اصحاب علم روزانہ بطور مستفسر شریک ہوتے رہے۔ اُن کے اٹھائے ہوئے دقیق علمی نکات اور پیش کردہ اشکالات شرکاء کی دلچسپی کا باعث بنے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب روزانہ ڈیڑھ گھنٹے پر محیط ہوتا تھا اور اس کے بعد سوال جواب کی نشست قریباً ایک گھنٹے تک ممتد ہوتی تھی۔ مستفسرین میں سے جو حضرات ان محاضرات میں خصوصی دلچسپی لیتے ہوئے ایک سے زائد بار تشریف لائے ان میں جناب جنرل ایم ایچ انصاری' علامہ شبیر بخاری' پروفیسر محمد سعید شیخ' جناب خورشید احمد گیلانی اور جناب سہیل عمر کے نام قابل ذکر ہیں۔ چھٹے دن یعنی ۲۸ اپریل کو ایک خصوصی اضافی نشست حاضرین کے سوالات کے جوابات کے لئے منعقد کی گئی۔ بحیثیت مجموعی محاضرات نہایت بھرپور' مفید اور کامیاب رہے۔

**فالحمدُ للّٰہ علیٰ ذٰلک!**

ڈاکٹر اسرار احمد

# قرآن کا قانونِ عذاب

ہمارا ایمان ہے کہ اس کائنات میں ایک پتہ بھی اللہ کے اذن کے بغیر جنبش نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی پورے یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے ان اٹل قوانین اور قواعد و ضوابط یعنی قرآن حکیم کی اصطلاح میں اللہ کی اس "سنت" کے تحت ہوتا ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ جیسے کہ فرمایا سورۃ الاحزاب کی آیت ۶۲ میں کہ:

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ○

"تم ہرگز نہ پاؤ گے اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی!"

بعینہٖ یہی مضمون سورۂ فاطر کی آیت ۴۳ اور سورۃ الفتح کی آیت ۲۳ میں بھی وارد ہوا ہے ـــــ لہٰذا اگر آج پوری دنیا میں مسلمان شدید مصائب اور آلام سے دوچار ہیں تو یہ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ کے کسی قانون یعنی اس کی اٹل اور مستقل سنّت کے تحت ہو رہا ہے۔ اور اگر ہم دل سے چاہتے ہیں کہ یہ صورت حال تبدیل ہو تو لازم ہے کہ قرآن حکیم پر تدبر اور تفکر کے ذریعے اللہ کے قانونِ عذاب کو سمجھنے کی کوشش کریں' اس لئے کہ اسی پر اصلاحِ احوال کی صحیح اور مؤثر تدابیر کے فہم و شعور کا انحصار اور دار و مدار ہے۔

قرآن حکیم کے عام اسلوب کے مطابق اس کا "قانونِ عذاب" بھی کہیں پورے کا پورا یکجا بیان نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس کی مختلف دفعات متفرق طور پر مختلف مقامات پر وارد ہوئی ہیں۔ اور اگر ان سب کو جمع اور مرتّب کر کے ان کی پشت پر کارفرما حکمت سمیت بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ:

(۱) یہ دنیا بنیادی طور پر دارالعذاب نہیں دارالامتحان ہے' اور جزاوسزا کا معاملہ اصلاً دنیا سے نہیں آخرت سے متعلق ہے۔ چنانچہ اس حیاتِ انسانی میں سے جو' علامہ اقبال کے اس قول کے مطابق کہ ؎

"تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں' پیہم دواں' ہردم جواں ہے زندگی"

اتنی طویل ہے کہ دنوں' مہینوں اور سالوں کیا صدیوں میں بھی نہیں ناپی جا سکتی' موت کا ایک وقفہ ڈال کر (؎ "موت اِک زندگی کا وقفہ ہے۔ یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر!") جو نہایت مختصر اور حقیر سا حصہ "حیاتِ دنیوی" کی صورت میں علیحدہ کر لیا گیا ہے' اس کی اصل غرض و غایت آزمائش اور امتحان و ابتلا ہے۔ جیسے کہ فرمایا گیا سورۃ الملک کی آیت ۲ میں کہ:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا

"اس نے بنائی موت اور زندگی تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے تم میں سے اچھے عمل کرنے والا!"

جس کی بہترین ترجمانی کی ہے علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ: ؎

"قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!"

اس امتحان میں انسان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ قیامت کے دن ہو گا' جہاں اگرچہ اس غرض کے لئے تو قوموں اور امتوں کی اجتماعی پیشی بھی ہو گی کہ ان کی جانب مبعوث کئے جانے والے رسول استغاثے کے گواہوں کی حیثیت سے ان پر حجت قائم کر سکیں کہ ہم نے تو تمہیں اللہ کا پیغام پہنچانے کا حق ادا کر دیا تھا' اب اپنے طرزِ عمل کے لئے تم خود جوابدہ ہو' تاہم اصل محاسبہ ہر انسان کا خالص انفرادی حیثیت پر ہو گا جیسے کہ فرمایا سورۂ مریم کی آیت ۹۵ میں کہ:

وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ○

"ان میں سے ہر شخص قیامت کے دن اللہ کے حضور میں پیش ہو گا فردا
فردا یعنی اکیلا اکیلا!"

گویا انفرادی سطح پر کسی انسان پر جو مصیبتیں حیاتِ دنیوی کے دوران نازل ہوتی ہیں وہ امتحان اور آزمائش کی غرض سے ہوتی ہیں' عذاب یا سزا کے طور نہیں۔ اس قاعدۂ کلیہ میں صرف ایک استثناء' جو بعض احادیثِ نبویہؐ سے معلوم ہوتا ہے' یہ ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے کسی نیک اور مقبول بندے کو دنیا میں کسی تکلیف میں اس لئے مبتلا کر دیتا ہے کہ اسے اس کی کسی خطا کا کفارہ بنا دے' تاکہ وہ آخرت کی سزا سے بچ جائے۔ تاہم منطق کے عام قاعدے کے مطابق اس استثناء سے قاعدۂ کلیہ ختم نہیں ہوتا!

(۲) البتہ اس قاعدۂ کلیہ کا کامل اطلاق صرف افراد پر انفرادی حیثیت سے ہوتا ہے۔ قوموں اور امتوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی اجتماعی غلط روی اور مجموعی بداعمالی کی سزا اکثر و بیشتر اس دنیا میں دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ بالکل صحیح فرمایا ہے علامہ اقبال نے کہ ؎

"فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملّت کے گناہوں کو معاف!"

اور قوموں اور امتوں پر وارد ہونے والے اس اجتماعی عذاب کا تلخ ترین پہلو یہ ہے کہ اس میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ یعنی گناہ گاروں کے ساتھ ساتھ بے گناہ بھی عذاب کا نوالہ بن جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا سورۃ الانفال کی آیت ۲۵ میں کہ:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

"اور ڈرو اس وبال سے جو تم میں سے صرف ظالموں ہی کو لاحق نہیں ہو گا!
اور جان رکھو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے!"

اگرچہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے ایک استثناء کی امید

دلائی ہے یعنی یہ کہ کسی قوم یا امت پر وارد ہونے والے اجتماعی عذاب سے ان لوگوں کے بچنے کی امید کی جا سکتی ہے جو نہ صرف یہ کہ خود بدی سے اجتناب کرتے رہیں بلکہ اپنی قوم کو غلط روش اور اللہ کی معصیت اور نافرمانی سے روکنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیں جیسے کہ سورۃ الاعراف میں اصحاب السبت پر نازل ہونے والے عذاب کے ضمن میں فرمایا:

اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْھَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ (آیت ۱۶۵)

"اور ہم نے بچا لیا ان لوگوں کو جو بدی سے روکتے رہے تھے!"

(۳) قوموں اور امتوں پر دنیا میں نازل ہونے والے عذاب کی بدترین اور شدید ترین صورت وہ ہے جس سے وہ قومیں دوچار ہوئیں جن کی جانب اللہ نے اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور انہوں نے ان پر اپنی دعوت و تبلیغ میں سعیِ بلیغ فرما کر اور حق کی قولی و عملی شہادت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھ کر اتمامِ حجت کا حق ادا کر دیا۔ اس کے باوجود ان کی قوموں نے بحیثیتِ مجموعی ان کی دعوت کو رد کر دیا اور حق کی راہ اختیار نہ کی تو ان پر "عذابِ استیصال" نازل ہوا۔ یعنی صرف رسولوں اور ان معدودے چند لوگوں کو بچا کر جو ان پر ایمان لائے' باقی پوری پوری قوموں کی جڑ کاٹ ڈالی گئی یعنی انہیں نیست و نابود اور نسیاً منسیاً کر دیا گیا۔ چنانچہ قرآن کا ہر قاری بخوبی واقف ہے کہ اسی عذابِ استیصال یا عذابِ اکبر کی مثالیں ہیں وہ عذاب جو قومِ نوحؑ' قومِ صالحؑ' قومِ لوطؑ' قومِ شعیبؑ اور آلِ فرعون پر نازل ہوئے جن کے نتیجے میں کہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْھَا "وہ ایسے ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں!" (سورۂ ھود: ۶۸ اور ۹۵) کہیں فرمایا گیا کہ اب لَا یُرٰٓی اِلَّا مَسٰکِنُھُمْ "ان کے مکانوں اور مسکنوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا" (سورۃ الاحقاف: ۲۵) یعنی ان کے مکین نیست و نابود ہو گئے! اور کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ: فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا "ان ظالموں کی جڑ کاٹ ڈالی گئی" (سورۃ الانعام: ۴۵)

واضح رہے کہ اس نوع کے عذاب کے ضمن میں قرآن نے ایک سے زائد

مرتبہ وضاحت اور صراحت کی ہے کہ یہ کسی رسول کی بعثت کے ذریعے اتمامِ حجت کے بعد ہی نازل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں اسی نوع کے عذاب کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ○ (آیت ۱۵)

"اور ہم عذاب بھیجنے والے نہیں ہیں جب تک کسی رسول کو مبعوث نہ کر دیں"

اور سورۃ القصص کی آیت ۵۹ میں بھی یہی قاعدۂ کلیہ بیان ہوا ہے کہ:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا

"آپ کے رب کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ بستیوں کو ہلاک کر دے جب تک ان کے مرکزی مقام پر ایک رسول نہ بھیج دے جو انہیں ہماری آیات سنا دے!"

اس عذابِ استیصال' یا عذابِ اکبر کے ضمن میں اللہ کی یہ سنت بھی قرآن میں بار بار بیان ہوئی ہے کہ جس قوم کی جانب اللہ تعالیٰ رسول کو مبعوث فرماتا تھا اس پر آخری اور بڑے عذاب سے قبل چھوٹے چھوٹے عذاب لوگوں کو جھنجوڑنے کی غرض سے نازل فرماتا تھا تاکہ جو جاگ سکتے ہوں جاگ جائیں اور جن میں اصلاح پذیری کا مادہ موجود ہو وہ اپنی اصلاح کر لیں۔ چنانچہ اسی سنتِ الٰہی کا ذکر ہے اختصار کے ساتھ سورۃ السجدہ کی آیت ۲۱ میں:

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○

"اور ہم انہیں لازماً مزہ چکھائیں گے چھوٹے عذاب کا بڑے عذاب سے قبل' شاید کہ یہ رجوع کر لیں!"

اور اسی کا تفصیلاً ذکر ہے سورۃ الانعام کی آیات ۴۱ تا ۴۵ اور سورۃ الاعراف کی آیات ۹۴ تا ۹۶ میں!

(۴) قوموں اور امتوں پر بحیثیت اجتماعی اس دنیا ہی میں نازل ہونے والے

عذابِ الٰہی کی دوسری قسم وہ ہے جو رسولوں کی امتوں پر ان کی غلط روی اور بداعمالی کے باعث نازل ہوتا ہے۔ یہ عذاب مقدم الذکر عذابِ استیصال سے اس اعتبار سے تو ہلکا ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے قوموں یا امتوں کا بالکل خاتمہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس اعتبار سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے کہ یہ وقفہ وقفہ سے مسلسل آتا رہتا ہے۔ اور جب کوئی مسلمان امت اس نوع کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہے تو اس پر جو کیفیت طاری ہو جاتی ہے اسے منفی طور پر بیان کیا جائے تو وہ اس جہنمی انسان کی سی ہوتی ہے جو قرآن کے الفاظ میں "ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى" کا مصداق ہو جاتا ہے یعنی "نہ وہ زندہ ہی رہتا ہے' نہ اسے موت آتی ہے"۔ اور اگر اسے مثبت طور پر بیان کیا جائے تو یوں کیا جا سکتا ہے کہ ع "زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا!"

اس قسم کے عذاب کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ جو قوم کسی رسول اور خاص طور پر کسی صاحبِ کتاب و شریعت رسول کی امت ہونے کی مدعی ہوتی ہے وہ گویا زمین پر اللہ کی نمائندہ ہونے کی دعویدار ہوتی ہے۔ اب اگر اس کا طرز عمل اور رویّہ اس کے دعوے کے برعکس ہو' اور وہ اپنے انفرادی اخلاق و اعمال اور سیرت و کردار اور اپنی اجتماعی تہذیب و ثقافت اور معاشی و سیاسی نظام میں کتابِ الٰہی کی تعلیمات اور شریعتِ خداوندی کے احکام سے مختلف ہی نہیں متضاد نقشہ پیش کرے تو یہ جرم ناقابل معافی ہے' اس لئے کہ اپنے اس طرز عمل کے باعث یہ نام نہاد مسلمان امت بجائے اس کے کہ خلق اور خالق کے مابین واسطہ (امتِ وَسَط) اور رابطے کا ذریعہ بنے' الٹی حجاب اور رکاوٹ بن جاتی ہے اور اس کو دیکھ کر اللہ کے بندے اللہ کے دین کی جانب راغب ہونے کی بجائے الٹے اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الصف کی آیات ۲' ۳ میں فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○

"اے ایمان کے دعویدارو! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ تمہارا یہ طرزِ عمل

کہ جو زبان سے دعویٰ کرو اس پر عمل میں پورے نہ اترو اللہ کے غضب کو بہت بھڑکانے والا ہے!"

اس نوع کے اجتماعی عذاب میں مبتلا ہونے والی اقوام یا امتوں کا ایک وصفِ مشترک' جسے قسمت کی ستم ظریفی ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے' یہ ہے کہ وہ اس زعم میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ہم تو اللہ کے بہت چہیتے اور لاڈلے ہیں' اور ہمارا معاملہ دوسرے عام لوگوں کا سا نہیں ہے بلکہ ہم اللہ کے یہاں خصوصی اور ترجیحی سلوک کے مستحق ہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس جہلِ مرکّب میں مبتلا قوم پر جیسے جیسے عذابِ الٰہی کے کوڑوں کی شدت بڑھتی جاتی ہے اس کے متذکرہ بالا زعم میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ گویا صورت یہ بن جاتی ہے کہ ادھر دُرے پر دُرہ پڑتا جاتا ہے' اور ادھر غرّہ پر غرّہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی کلاسیکل مثال ہے سابقہ امتِ مسلمہ یعنی یہود اور نصاریٰ کا یہ قول جو سورۃ المائدہ کی آیت ۱۸ میں نقل ہوا ہے کہ:

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ

"ہم تو اللہ کے بیٹے ہیں' اور اس کے نہایت چہیتے اور لاڈلے!"

جس پر اللہ تعالیٰ نے نہایت عبرت انگیز تبصرہ فرمایا:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ

"اے نبیؐ ان سے کہئے کہ پھر اللہ تم پر تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں نازل فرماتا رہا ہے؟ تمہارے اس زعم کے برعکس تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے دوسرے جو اللہ نے پیدا فرمائے!"

اسی طرح ان کا ایک مزعومہ عقیدہ یہ بھی تھا کہ:

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً

"ہمیں تو (جہنم کی) آگ چھو ہی نہیں سکتی سوائے گنتی کے چند دنوں کے!"

جس پر نہایت فصیح و بلیغ تبصرہ وارد ہوا:

قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرہ آیت ۸۰)

"اے نبیؐ ان سے پوچھئے کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے جس کے بارے میں تمہیں وثوق ہے کہ اللہ ہرگز اپنے اس عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا؟ یا تم بغیر کسی علم کے اللہ کی جانب غلط باتیں منسوب کر رہے ہو؟"

اس نوع کے اجتماعی عذاب کے بارے میں یہ قاعدۂ کلیہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ ع "جن کے رتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے!" کے مطابق کسی امت کو جس قدر بلند درجۂ فضیلت حاصل ہوتا ہے اس کے غلط طرز عمل پر عذاب کی شدت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی بھی نہایت نمایاں مثال قرآن حکیم میں سابقہ امتِ مسلمہ یعنی یہود ہی کے ضمن میں وارد ہوئی ہے۔ یعنی ان پر عذابِ الٰہی کی شدت کے بیان کے لئے جو الفاظ سورۃ البقرہ کی آیت ۶۱ میں وارد ہوئے ہیں کہ:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ

"ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے!"

ان سے کچھ ہی قبل یہ آیتِ مبارکہ بھی وارد ہوئی ہے کہ:

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ (البقرہ: ۴۷)

"اے بنی اسرائیل! ذرا یاد کرو میرے ان انعامات و احسانات کو جو میں نے تم پر کئے۔ اور میں نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرما دی تھی!"

پھر یہی معاملہ کسی مسلمان امت کے مختلف طبقات کا ہے کہ ان میں سے جسے جتنی زیادہ فضیلت حاصل ہوتی ہے' اتنی ہی زیادہ اس کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے' اور غیر ذمہ دارانہ طرز عمل کے نتیجے میں اتنی ہی سخت سزا بھی اسے ملتی ہے!

(۵) مندرجہ بالا مباحث سے یہ نتیجہ ازخود برآمد ہو جاتا ہے کہ جو قوم نہ کسی

رسول کی امت ہونے کی مدعی ہو نہ ہی اس کی جانب اس کی یادداشت اور معلوم و محفوظ تاریخ کی حد تک کوئی رسول مبعوث ہوا ہو اس کے عذاب و ثواب اور جزا و سزا کا سارا معاملہ آخرت سے متعلق ہے۔ حیاتِ دنیوی کی حد تک وہ حیوانات اور چرند و پرند کے مانند اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۲۰ "كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ" اور سورۃ الاحقاف کی آیت ۲۰ "اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا" کے مطابق اللہ کی عطا اور جُود و سخا کے دسترخوان سے کھا پی سکتے ہیں' اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کی حد تک تو ان پر صرف سپنگلر کے فلسفۂ تاریخ کے مطابق اس قانونِ طبعی ہی کا اطلاق ہو گا کہ جیسے ہر فرد پیدا ہوتا ہے' پھر جوان ہوتا ہے' پھر بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے ایسے ہی قومیں اور تہذیبیں بھی مختلف طبعی ادوار سے گذر کر بالآخر ختم ہو جاتی ہیں۔ رہا حیاتِ اخروی اور یومِ قیامت کے محاسبہ کا معاملہ تو وہ تو ہر فرد نوعِ بشر کا اپنے اپنے نظریات و عقائد اور اخلاق و اعمال کے اعتبار سے طے ہونا ہی ہے!

---

بقیہ: اسلامی ثقافت اور نوجوان نسل کا کردار

---

محنت (اس میں ہر قسم کی زبانی' مالی' قلمی اور بدنی کوشش اور محنت شامل ہے اور جہاد کی تمام قسمیں بھی یعنی جہاد بالنفس' جہاد با شیطین' جہاد با لکفار' جہاد با لبغاۃ اور جہاد با لمبطلین)۔ اس نے تم کو پسند کیا اور دین میں تمہارے لئے کوئی تنگی اور مشکل نہیں رکھی۔ یہ ملت ہے تمہارے باپ ابراہیمؑ کی۔ اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے پہلے سے بھی اور اس قرآن میں بھی تاکہ رسولؐ تم پر گواہ ہو اور تم تمام بنی نوعِ انسان پر گواہ ہو جاؤ۔ سو قائم رکھو نماز اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو مضبوط پکڑو (یعنی اللہ کے دین اسلام کو) وہ تمہارا مالک ہے۔ سو خوب مالک ہے اور خوب مددگار۔"

حکمتِ اقبال
ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم

# خودی اور سوشلزم

## سوشلزم کا فلسفہ

دورِ حاضر کے سب سے زیادہ مقبول اور با اثر اور سب سے زیادہ گمراہ کرنے والے یعنی خودی کو اپنے مقصود سے ہٹانے والے غلط اور ناپائیدار نظریات میں وطنیت کی طرح سوشلزم بھی شامل ہے۔ جس طرح سے نظریۂ وطنیت کا فلسفی اور مبلغ میکیاولی ہے اُسی طرح سے نظریۂ سوشلزم کا مبلغ اور فلسفی کارل مارکس ہے۔ مختصر طور پر سوشلزم کا فلسفہ یہ ہے کہ کائنات کی آخری حقیقت مادّہ ہے جو خود بخود ارتقاء کرتا رہا ہے۔ اپنے ارتقاء کے ایک مقام پر اس کے اجزاء کو ایک خاص کیمیاوی ترکیب اور طبیعیاتی ترتیب حاصل ہوگئی جس کی وجہ سے اُس کے اندر زندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ پھر زندہ مادّہ ترقی کرتا رہا، یہاں تک کہ انسان ظہور پذیر ہوا۔ پھر انسان کی مادّی ضروریات کی تشفّی کا اہتمام اور نظام ترقی کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ وہ سوشلزم تک پہنچے گا جہاں انسان کی مادّی ضروریات کی تشفّی اور تکمیل کے نظام کو ایک ابتدائی کمال حاصل ہو جائے گا۔ مستقبل کے ارتقاء سے سوشلزم دولت کی مساوی تقسیم کے ایک نظام کی حیثیت سے نہ صرف اندرونی طور پر اپنے پورے کمال کو پہنچے گا بلکہ بیرونی وسعت پاکر پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔ دنیا کے تمام فلسفے اور مذاہب اور تمام اخلاقی، علمی، فنی اور سیاسی نظریات اور معتقدات انسان کے معاشی حالات کے عارضی کرشمے ہیں جن کی اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں، کیونکہ دنیا میں روح ہے اور نہ خدا، اور انسان کی زندگی کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ اپنی جسمانی ضروریات کی بہتر سے بہتر تشفی کرے۔ سوشلزم کے فلسفہ کے اس مختصر خاکہ سے ظاہر ہے کہ وہ ایک معاشی اور

اقتصادی نظریہ ہی نہیں بلکہ انسان اور کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہے جو اپنے اندر حرکتِ تاریخ کے مدّعا اور مقصود کا ایک فلسفہ بھی رکھتا ہے اور وہ اپنی ان تینوں حیثیتوں سے اسلام کے ساتھ متصادم ہوتا ہے کیونکہ اسلام بھی انسان اور کائنات کا ایک فلسفہ ہے جو اپنے اندر ایک معاشی اور اقتصادی نظریہ ہی نہیں بلکہ حرکتِ تاریخ کے مدّعا اور مقصود کا ایک فلسفہ بھی رکھتا ہے جس کی رُو سے اسلام تمام ادیان اور نظریات پر غالب ہو کر رہے گا۔ روس کا موجودہ نظام سوشلزم ہے جس کی اگلی ترقی یافتہ صورت اشتراکیت یا کمیونزم ہوگی' جہاں مارکسیوں کے عقیدہ کے مطابق کسی حکومت کی وساطت کے بغیر دولت ہر شخص کی ضرورت کے مطابق خود بخود مساوی طور پر تقسیم ہوتی رہے گی۔ اگر نظریۂ وطنیت خشت و سنگ کے ایک سلسلہ کو وطن کا نام دے کر خدا کا قائم مقام معبود یا بُت بناتا ہے تو نظریۂ سوشلزم انسان کے جسم کو اقتصادی ضرورتوں کا نام دے کر خدا کا قائم مقام معبود یا بُت بناتا ہے اور انسان کی اصل ضرورتوں کو نظر انداز کرتا ہے بلکہ اُن کی شدید مخالفت کرتا ہے۔

## انسان کی حقیقت

اصل انسان انسان کا جسم نہیں بلکہ اُس کی خودی یا رُوح ہے جو جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ انسان کا جسم اصل انسان کے عارضی کنٹرول میں دیا ہوا ایک خدمت گزار حیوان ہے جس سے اصل انسان اس دنیا میں اپنی ضرورتوں کو پُورا کرنے کے لیے کام لیتا ہے۔ جسم کی حیثیت ایسی ہے جیسے کہ کوئی مسافر اپنے گھر تک پہنچنے کے لیے ایک ٹیکسی سے عارضی طور پر مانگ لے اور پھر واپس کر دے اور اصل انسان یا خودی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کی محبّت کا ایک طاقتور جذبہ ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خودی کی تمام خواہشیں اور آرزوئیں' خواہ براہِ راست اس سے تعلق رکھتی ہوں یا اس کے ٹیکسی سے صرف ایک جذبہ کے ماتحت رہتی ہیں اور اسی کی خاطر بروئے کار آتی ہیں اور اُس کے تمام ارادے اور فیصلے اور تمام اعمال و افعال بھی اسی ایک جذبہ کی تشفی کے لیے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ خودی جب بھی اپنے کسی عمل سے حرکت کرتی ہے تو جمالِ خداوندی سے اور قریب ہونے اور اس سے اور زیادہ مستفید اور متمتع ہونے کے لیے حرکت کرتی ہے یا وہ حرکت کرتی ہی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی اس کا خدا فی الواقع سچا خدا ہوتا ہے اور کبھی وہ جہالت کی وجہ سے غیر خدا کو سچا خدا سمجھ لیتی ہے اور غلط طور پر خدا کی ساری صفات اس کی طرف منسوب کر دیتی ہے۔ خدا کی محبّت کے جذبہ کی

تشفّی خودی کی سب سے پہلی اور سب سے آخری ضرورت ہے اور خودی کی باقی تمام ضرورتیں فقط یہ اہمیت رکھتی ہیں کہ وہ اس ضرورت کے ماتحت اُس کی خدمت گزار ہیں۔ ان ماتحت ضرورتوں میں جسم کے قیام اور بقا کی ضرورت بھی شامل ہے، تاکہ یہ حیوان جو اصل انسان یا خودی کی سواری ہے زندہ اور تندرست توانا رہے اور ایک ضروری عرصہ کے لیے خودی کے کام آتا رہے لیکن اگر کسی وقت ایسی صورتِ حال پیش آجائے کہ جسم کی حفاظت یا پرورش خودی کی ضرورت کے منافی ہو تو اس وقت خودی جسم کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر قربان کرتی ہے۔ یہاں تک کہ جسم کو ترک کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اگر جسم کی ضرورت انسان کے نصب العین کا ذریعہ نہ رہے بلکہ خود نصب العین بن جائے تو وہ خود خدا کا مقام لیتی ہے اور ایک بُت یا جھوٹا معبود یا خدا بن جاتی ہے اور انسان کی اصل ضرورت کو بھلا دیتی ہے اور انسان ناکام اور نامراد رہ جاتا ہے۔

## سوشلزم کی خرابی

سوشلزم کی خرابی یہ ہے کہ وہ اصل انسان یا خودی کی ضرورت یعنی خدا کی محبّت کو نظر انداز کر کے اس کی سواری کی ضرورت یعنی جسم کے قیام اور بقا کی ضرورت کو پُورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ٹٹو پر سوار ہو کر گھر جانے والا مسافر راستہ میں ٹٹو پر ہی مرمٹے اور سفر کر کے جلد از جلد گھر پہنچنے کی بجائے اسی کی خاطر مدارات کرنے اور اسی کو فربہ کرنے میں لگا رہے اور اپنی منزل کو بھول جائے یہاں تک کہ شام ہو جائے اور پھر چور اس کا سامان لُوٹ لیں اور اُسے قتل کر جائیں۔ اقبال کا استاد رومیؒ جسم کی ضرورت کے لیے خودی کی ضرورت کو نظر انداز کرنے والے ایسے ہی کوتاہ نظر انسان کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی زمین میں اپنا گھر نہ بناؤ کہ وہاں سے بیدخل کیے جاؤ گے اور کسی بیگانے کا کام نہ کرو بلکہ اپنا کام کرو۔ اور یہ بیگانہ کون ہے؟ یہی تمہارا خاکی جسم جس کے غم میں دن رات گھلتے رہتے ہو۔

در زمینِ مرداں خانہ مکن　　کارِ خود کن کارِ بیگانہ مکن
کیست بیگانہ تنِ خاکیِ تو　　کز برائے اوست غمناکیِ تو

## قدرت کی رہنمائی

اگرچہ خدا کی محبت کا جذبہ جو خودی کی فطرت ہے نہایت طاقتور ہے، تاہم خودی اس کے متعلق صرف اتنا ہی جانتی ہے کہ وہ کسی ایسے محبوب کے لیے ہے جو منتہائے حسن و کمال ہے لیکن واضح طور پر نہیں جانتی کہ وہ محبوب درحقیقت کون ہے۔ لہٰذا امکان تھا کہ خودی اس فطری جذبہ کے اصل مقصود کو سمجھنے اور اس کی تشفی کرنے میں اپنے کسی قصور کے بغیر اور محض قدرت کی راہ نمائی کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے غلطیاں کرتی اور ٹھوکریں کھاتی رہتی، لیکن قدرت کبھی اس قسم کی صورت حال پیدا ہونے نہیں دیتی۔ چنانچہ وہ کائنات میں کسی جاندار کی کوئی ضرورت ایسی پیدا نہیں کرتی جس کی تشفی کا اہتمام خود نہ کرے اور خودی کا جذبۂ محبت اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا تھا۔ اور پھر یہ جذبہ عبث پیدا نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کی صحیح اور پوری تشفی کائنات کے سارے بعد کے ارتقاء کا ذریعہ بننے والی تھی۔ لہٰذا ضروری تھا کہ قدرت اپنے ہی پیدا کیے ہوئے اس نہایت اہم جذبۂ محبت کی راہ نمائی خود کرتی۔ اور قدرت نے اس جذبہ کی راہ نمائی کا جو اہتمام کیا ہے اُسی کو ہم مظہرِ نبوت کا نام دیتے ہیں۔ خودی کے حقائق کی تعلیم ہمیں سب سے پہلے نبوت ہی سے ملتی ہے۔ خدا نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو خودی کے جذبۂ محبت کی صحیح راہ نمائی کے لیے بھیجا اور آخر کار اُس نے انبیاء کے سلسلہ کو ایک رحمۃ للعلمین (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ختم کر دیا۔ اُن پر قرآن حکیم نازل کیا اور اُن کی نظری تعلیم اور عملی زندگی کی مثال میں انبیاء کی اس راہ نمائی کو مکمل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال بڑے زور سے اس بات کا مدعی ہے کہ اُس کے فلسفہ خودی کا اصل منبع قرآن حکیم ہے بلکہ قرآن کے سوائے اس کا کوئی اور منبع نہیں۔ اقبال جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ اگر میرے الفاظ میں قرآن کی تعلیم کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے اور اگر میرے دل میں خدا کی محبت نہیں تو روزِ محشر اپنے پاؤں کے بوسہ سے محروم کر کے مجھے خوار و رسوا کر دیجیے۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پاکن مرا

لہٰذا یہ دیکھنے کے لیے کہ سوشلزم ایسا ایک نظریۂ حیات خودی کے ساتھ کیا تعلق رکھتا ہے اور خودی پر کس طرح سے اثر انداز ہوتا ہے ہمیں اقبال کے فلسفہ خودی کے اصل منبع یعنی قرآنِ حکیم

کی تعلیمات کو بھی مدنظر رکھنا پڑے گا۔

## انبیاء علیہم السلام کی تعلیم

خدا کے انبیاء نے انسانوں سے کہا کہ اپنے جذبۂ محبت کی تشفی کے لیے ضروری ہے کہ تم قدرت کا مشاہدہ کرو اور خدا کی صفات کو مظاہرِ قدرت میں دیکھو اور عبادت اور ذکر کے ذریعہ سے خدا کی صفات کے حسن و کمال پر غور کرو۔ لیکن ایسا کرنا کافی نہیں۔ خدا کی محبت کے جذبہ کی مکمل تشفی اور خودی کی مکمل تربیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ تم خدا کی صفات کو اپنے اعمال میں ظاہر کر کے خدا کے اخلاق کے ساتھ متخلق ہو جاؤ۔ وہ رحیم ہے' تم بھی لوگوں پر رحم کرو۔ وہ کریم ہے' تم بھی کرم کرو۔ وہ عادل ہے' تم بھی عدل کرو۔ لوگوں کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو' لوگوں کا حق نہ مارو' اُن کا مال غلط طریقوں سے نہ کھاؤ اور مزدور کی محنت کا معاوضہ بلا توقف ادا کرو۔ وہ صادق ہے' تم بھی صدق کو اپنا شعار بناؤ۔ وہ غفور ہے' تم بھی لوگوں کی خطاؤں کو معاف کرو۔ وہ حفیظ ہے' تم بھی لوگوں کی حفاظت کا ذمہ لو۔ وہ لوگوں کی حاجتوں کو پُورا کرتا ہے' تم بھی لوگوں کی حاجتوں کو پُورا کرو۔ وہ رزاق ہے اور ہر انسان کے جسم کو زندہ اور تندرست اور توانا رکھنے کے لیے اس کو رزق بہم پہنچاتا ہے' تم بھی اپنے رزق میں سے لوگوں کو رزق دو اور اُن کے جسموں کو زندہ اور تندرست اور توانا رکھنے کی کوشش کرو۔ وہ شافی ہے اور لوگوں کی بیماریوں کو دُور کرتا ہے' تم بھی بیماروں کی تیمارداری اور علاج اور حفظانِ صحت کے اصُولوں کی تعلیم اور تلقین سے بیماریوں کو دُور کرو۔ وہ ہادی ہے اور انسان کی خودی کو زندہ اور تندرست و توانا رکھنے کے لیے انبیاء بھیج کر اپنی ہدایت اُن تک پہنچاتا ہے' تم بھی اس غرض کے لیے خدا کے انبیاءؑ کی دی ہوئی ہدایت لوگوں تک پہنچاؤ۔ وغیرہ

## تربیتِ خودی کے زرّیں مواقع

مومن اپنی خودی کی تربیت اور ترقی کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا۔ جب گردوپیش کے حالات خدا کی صفاتِ ربوبیت' رزّاقیت اور عدل کے اظہار کا تقاضا کر رہے ہوں تو ایسے حالات میں مومن کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اُن صفات کا اظہار کرے۔ ورنہ تخلّق باخلاقِ اللہ کے کئی امکانات اور

خودی کی تربیت اور ترقی کے کئی زرّیں مواقع اس کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں اور وہ مومن کے مقام سے گر جاتا ہے اور خدا کی اس سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے جو اس نے خودی کی ضروریات کی طرف سے غفلت کے اندر رکھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص مومن نہیں جو خود تو پیٹ بھر کے کھائے اور اُسے معلوم ہو کہ اُس کے پاس ہی اُس کا ہمسایہ بھوکا ہے۔ (لیس بمؤمن من یشبع وجارہ جائع مع جنبہ ـــــ الحدیث) جب اہلِ دوزخ سے پوچھا جائے گا کہ کونسا جُرم تم کو دوزخ میں لے آیا ہے تو وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور (یہ جاننے کے باوجود کہ بعض مساکین کھانے کے لیے محتاج ہیں) مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ (المدثر: ۴۳، ۴۴) چونکہ مومن خدا کی صفاتِ ربوبیت و رزاقیت سے اپنی خودی کی تربیت کی خاطر حصّہ لینا چاہتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس کے مال میں اس شخص کا بھی حق ہے جو اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے سوال کرنے پر مجبور ہوا ہے اور اُس شخص کا بھی جو حفظِ وضع کے خیال سے سوال تو نہیں کرتا لیکن ضروریاتِ زندگی کے سامان سے محروم ہے: وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (الذاریات: ۱۹) مومن کی اس ضرورت کی وجہ سے یہ حکم ہوا تھا کہ فے کے مال کو اس طرح سے تقسیم کرو کہ وہ تمہارے دولت مندوں میں ہی گھومتا نہ رہے بلکہ مفلسوں تک بھی پہنچے: كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (الحشر: ۷)

## ایک غلط فہمی اور اس کے اسباب

چونکہ نبوّت کی تعلیم خدا کی محبت کے جذبہ کو مطمئن کرنے اور خدا کے اخلاق کو اپنانے کے مختلف ذرائع میں سے ایک ذریعہ کے طور پر لوگوں کو کھانا کھلانے اور لوگوں میں مال اور رزق تقسیم کرنے پر زور دیتی ہے۔ اس سے بعض مسلمانوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ نبوّت کی تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ خدا کے خوف یا خدا کی محبّت کا واسطہ دے کر مفلسوں کی مالی اور اقتصادی ضروریات کا اہتمام کرے تاکہ افلاس دُور ہو۔ گویا اُن کا خیال ہے کہ نبوّت بھی وہی بات کہتی ہے جو سوشلزم کہتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نبوّت خدا کا نام لیتی ہے اور سوشلزم خدا کا منکر ہے۔ لیکن خدا کا نام لینے سے عملی طور پر جو فائدہ متصوّر ہے یا جو مقصد زیرِ نظر ہے وہ یہی ہے کہ خدا کے بندوں کی معاشی ضرورتوں کو پورا کیا جائے

اور یہ مقصد سوشلزم نہایت عمدہ طریق سے پورا کر رہا ہے' بلکہ (معاذ اللہ) جو کام نبوّت نہ کر سکی تھی سوشلزم نے کر دکھایا ہے۔ لہٰذا ہمیں سوشلزم کو قبول کر لینا چاہیئے تاکہ نبوّت کا جو اصل مقصد ہے وہ اچھی طرح سے پورا ہو۔ لیکن چونکہ ہم مسلمان ہیں ہمیں خدا کا نام یا اسلام بھی ساتھ رکھ لینا چاہیے۔ تعلیمِ نبوّت کی اس بے سر و پا جسمانی' مادی یا منفعتی توجیہہ کے اسباب حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ سوشلزم سے مرعوبیت۔

۲۔ دورِ حاضر کی علمی اور اخلاقی بے خدائیت۔

۳۔ تعلیمِ نبوّت کے اسرار اور خودی کی فطرت کے حقائق سے ناواقفیت۔

اصل بات یہ ہے کہ نبوّت جسم کی ضرورت کا نہیں بلکہ خودی یا روح کی ضرورت کا اہتمام کرتی ہے۔ اور اگر جسم کی ضرورت کا اہتمام بھی کرتی ہے تو صرف اس خیال سے اور اس حد تک کہ جسم زندہ رہ کر بدستور خودی کی ضرورت کا ممدّ و معاون بنا رہے۔ اس کے نزدیک جسم خودی کے لیے ہے' خودی جسم کے لیے نہیں۔

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است
تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

نبوّت کے نزدیک اس دنیا کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسان اسے خدا کی محبّت کی نشوونما کے لیے کام میں لائے' نہ کہ اس دنیا کو اپنے رہنے کا ایک مستقل مقام سمجھ کر عیش و عشرت میں لگ جائے۔

مقام پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ جہاں
نہ سیرِ گل کے لیے ہے نہ آشیاں کے لیے (اقبال)

# اسلامی ثقافت کے آئینے میں
# نوجوان نسل کا کردار (۳)

ازقلم : عبدالماجد
لیکچرر بائیالوجی، گورنمنٹ کالج، اکوڑہ خٹک (نوشہرہ)

## تجدیدِ ایمان اور دعوتِ دین

آج عالم اسلام کے سپوتوں کو اپنے فرض منصبی یعنی **وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ**[1] (تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو "خیر" کی طرف لوگوں کو بلائے' اچھے کاموں کا حکم کرے اور برے کاموں سے منع کرے) کو سمجھ کر اپنے اندر یہ اہلیت پیدا کرنی چاہئے کہ وہ تمام امتِ مسلمہ کے افراد کے قلوب میں صحیح ایمان کی تخم ریزی کرسکیں' جذبۂ دینی کو پھر سے متحرک بنائیں اور (پہلی) اسلامی دعوت کے اصول و طریق کے مطابق مسلمانوں سے تجدیدِ ایمان کرائیں (**يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا** کے مطابق) کیونکہ ایمان حقیقی ہی سب اعمال کا سرچشمہ ہے۔ یہی وہ رمز ہے جو حضرت ابنِ عباسؓ کے اس قول میں بیان ہوئی ہے : **تَعَلَّمْنَا الْاِيْمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْاٰنَ** (کہ ہم نے پہلے ایمان سیکھا پھر قرآن)۔ اس دعوتِ ایمان اور دعوتِ دین کے لئے وہ سب طریقے کام میں لائیں جو اسلام کے ابتدائی داعیوں نے استعمال کئے۔ آج پھر مسلمانوں کو ایمان و اسلام پر لانے اور باطل کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لئے امام غزالیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور شیخ احمد سرہندیؒ جیسی نابغہ عصر شخصیات کی ضرورت ہے جو ایک نئی تہافت[2] تصنیف کرکے جدید منطقیین پر از سرِنو[3] رد کرسکیں۔ اور

---

۱۔ آل عمران' آیت ۱۰۴

۲۔ مراد تہافت الفلاسفہ تالیف امام غزالیؒ

۳۔ الرد علی المنطقیین تالیف امام ابن تیمیہؒ

مسلم اُمّہ کو (دعوتِ دین کے) اپنے اصلی کام پہ لائیں۔ وہ نوجوان ایمان و اخلاق اور کردار کی ایسی بلندیوں پر ہوں جنہیں دیکھ کر خدا کا فرمان یاد آجائے کہ : **اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى**[۴] کہ وہ ایسے نوجوان ہیں کہ جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم (اللہ) نے اس ایمان کے بدلے میں انہیں مزید ہدایت و رہنمائی عطا کی۔ ان نوجوانوں کو دیکھ کر ایک بار بلال و عمار، خباب و خبیب، مصعب بن عمیر اور حسن و حسین (رضی اللہ عنہم اجمعین) کے جوشِ ایمانی اور ایثار کے نمونے یاد آجائیں۔ جنت کی ہوائیں اور قرنِ اول کے ایمانی جھونکے دوبارہ چلیں اور ایک نیا عالمِ اسلام ظہور میں آئے جس سے موجودہ عالمِ اسلام (جو صرف برائے نام ہے) کو کوئی نسبت نہیں ہوگی۔

## غیر مسلموں کو دعوتِ دین کا حکیمانہ اسلوب

ایک مسلم و غیر مسلم کے لئے طریقِ دعوتِ دین علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے، کیونکہ ایک مسلم تو جانتا ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے، احادیثِ رسولؐ برحق ہیں۔ لیکن ایک غیر مسلم ان باتوں کو جانتا بھی ہو تو مانتا نہیں، اس لئے ہمیں بمطابق آیت **"اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ"** "حکمت" سے کام لینا ہوگا اور اسے مظاہرِ کائنات اور قوانینِ فطرت سے دلائل دیکر معلوم حقائق (Known.Facts) سے نامعلوم حقائق (اس کی نگاہ میں) یعنی قرآن کی طرف لانا ہوگا۔ یہی وہ اندازِ فکر ہے جس کے ذریعے ہم طبیعیات (Physics)، نفسیات (Psycholgy) اور حیاتیات (Biology) کے مسلمہ قوانین بیان کرکے اور ان کی تصدیق قرآن حکیم سے پیش کرکے جدید علوم کو اغلاط سے پاک بھی کرسکتے ہیں اور مشید بھی، کیونکہ قرآن کے نزول کا مقصد ہی یہی ہے کہ **لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ** یعنی حق کا اِحقاق اور باطل کا اِبطال کردیا جائے۔[۵]

اسی طرح آج غیر مسلم اقوام میں مذہب کے بارے میں جو غلط طرزِ فکر پیدا کردیا گیا ہے کہ مذہب اور سائنس دو مختلف و متضاد چیزیں ہیں، اس کو دلائل سے ختم کرنا ہے اور اس چیز کی دعوت دینی ہے کہ اور کوئی مذہب ایسا ہو بھی سکتا ہے (جیسا کہ کلیسائی مذہب

---

۴۔ سورۃ الکھف، آیت ۱۳

۵۔ ملاحظہ ہو المستقبل لھذا الدین ص ۶۳، از سید قطب شہید

نے سائنسی ایجادات و اکتشافات کے بارے میں مخالفانہ رویہ اختیار کیا اور سائنس کو خلافِ مذہب قرار دیکر ہزاروں افراد کو مذہبی جیلوں (Iniguisition) بھیج دیا اور ۳۳ ہزار افراد زندہ جلا دیئے۔ انہی میں علامہ برونو اور گلیلیو جیسے لوگ شامل تھے) لیکن اسلام تو ایمان کا محرک ہی غور و فکر اور مشاہدہ کو قرار دیتا ہے اور اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ (کیا تم غور و فکر نہیں کرتے)' اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے اور اَفَلَا تَنْظُرُوْنَ (کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟) کہہ کر بار بار غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اپنے تو درکنار غیر بھی اعتراف کرتے ہیں[۶]

## جدید فکری اور تہذیبی مسائل کا حل

اسلام وہ جامع اور ہمہ گیر تہذیب ہے جو کسی زمان و مکان (Time.&.space) کی پابند نہیں بلکہ خاص زمان و مکان سے بالاتر ہر زمان و مکان کے لئے تازہ اور Up-to-date ہے۔ کیونکہ قرآن وہ عظیم کتاب ہے جس میں تمام اشیاء کے بارے میں اصولی ہدایات دی ہوئی ہیں (اور احادیث میں ان کی تفصیل ہے) ارشادِ خداوندی ہے: وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ[۷] یعنی ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب اتاری جس میں تمام اشیاء کے بارے میں بیان ہے۔ اسی کو عربی شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرْاٰنِ لٰکِن تَقَاصَرَ عَنْہُ اَفْہَامُ الرِّجَالِ

اور بزبانِ اقبال۔

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عصرہا پوشیدہ در آناتِ اوست

علاوہ ازیں اسلام ہر پیش آمدہ مسئلہ کو اجماع' قیاس اور اجتہاد کے ذریعے حل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام کی اسی صفت کا اعتراف برنارڈ شا نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"It is the only religion which appears to me to possess the assimilating capability to the changing phase of existence which can make to appeal every age."

اس لئے ہمارے نوجوان علماء اور دانشور حضرات کو اجتہاد کے ذریعے ہر پیش آنے والے

---

۶۔ ملاحظہ ہو موریس بکائے کی کتاب The Bible, The Quran and Science

۷۔ سورۃ النحل' آیت ۸۹

مسئلہ کا حل تلاش کرنا ہے اور "دین کے حکیمانہ اندازِ فکر سے اجتہاد کو حریت پسندانہ اندازِ استدلال سے نکال کر افادیت و دانش کے وسیع تر سانچے میں ڈھالنا ہے"[۸] اور جدید ایجادات جیسے ٹیلی ویژن' سینما اور فلم سے نیک کردار اور قومی و ملی روایات کے احیاء کا کام لینا ہے اور اسی طرح جدید مسائل جیسے چاند پر اور زیرِ سمندر نماز کا مسئلہ' مصنوعی حمل' ٹیسٹ ٹیوب بے بی (اور اس سے پیدا شدہ وراثت وغیرہ کے احکام) اعضاء کی پیوندکاری (Transplantation of organs) اور بیمہ انشورنس کی طرح کے معاشرتی اور معاشی مسائل کے بارے میں غور و فکر سے کوئی فیصلہ صادر کرنا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھنا ہے کہ یہ اجتہاد حقیقی اور افراط و تفریط سے پاک ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ع "خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں" کے مصداق اسلام کی صورت مسخ کرکے تحریف کا لباس پہنادیں اور ہر نئی چیز کو معذرت خواہانہ انداز سے قبول کرلیں۔ نہیں' بلکہ اپنی ملی و دینی روایات اور اسلاف کے تحقیقی کارناموں کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کرنا ہے۔

## اسلامی اقدار و صفات کا احیاء اور غیروں کے ثقافتی اطوار کا اخراج

آج تمام انسانیت لادینی نظریات کے ثمرات اور مغربی تہذیب کے عیشِ فراواں سے مایوس ہوچکی ہے۔ اخلاقی و دینی تعلیمات سے محرومی اور صدیوں کے بے تربیتی کے ساتھ علم و صنعت اور تحقیق و اکتشافات کی ترقی سے قوت و اخلاق میں کوئی توازن نہیں رہا اور بقول پروفیسر جوڈ "علومِ طبعی نے ہم کو وہ قوت بخشی جو دیوتاؤں کے شایانِ شان تھی لیکن ہم اس کو بچوں اور وحشیوں کے دماغ سے استعمال کررہے ہیں"[۹]۔ اس لئے موجودہ زمانہ مسلمان نوجوانوں کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اٹھو اور پوری انسانیت کو اخلاق باختگی کے گڑھے سے نکال کر اسلام کے سایۂ رحمت میں جگہ دو اور تبادلے کے اصول کے مطابق اپنا مذہبی و اخلاقی سرمایہ مغرب کے حوالے کرکے اس کے تمدنی علوم و فنون کے سرمایہ کو خود لے لو۔ اس میں نہ صرف دونوں کا بھلا ہے بلکہ تمام انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔ واضح رہے کہ یہ علوم و فنون دراصل اس کا اپنا سرمایہ نہیں بلکہ ہمارے ہی آباء و اجداد کی

---

۸ ۔ یہ قول علامہ ندوی صاحب کے مضمون "اسلام کا تصور ثقافت" ص ۶ از کتاب "اساسیات اسلام" سے ماخوذ ہے۔

۹ ۔ Guide to Modern Wickedness

وراثت ہیں جو مغربی اقوام کو خصوصیت کے ساتھ سپین کی راہ سے ملے تھے۔

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی  دارائے جہاں را تو یمینی' تو یساری!
اے بندۂ خاکی تو زمینی تو زمانی  بہائے یقیں درکش و از دیر گماں خیز!
از خوابِ گراں' خوابِ گراں' خوابِ گراں خیز!

آج نوجوان نسل کو غیروں کے ثقافتی اقدار کے طوق کو اپنے گلے سے اتار پھینکنا ہے اور شادی بیاہ سے لیکر موت تک کے تمام مواقع پر ہندووانہ اور مغربی اطوار کو ترک کرکے اسلامی روایات و اقدار اپنانی ہیں جس میں دونوں جہانوں کی کامیابی ہے۔ نوجوان نسل کو چرس' چانڈو' کوکین' بھنگ' افیون اور ہیروئن جیسی تمام نشہ آور اشیاء کو اسلامی ممالک سے بدر کرنا ہے (بمطابق حدیث "کُلُّ مُسکِرٍ حَرَامٌ" کہ تمام نشہ آور اشیاء حرام ہیں) نوجوان شعراء اور ادباء کو گل و بلبل کے روندے ہوئے فرسودہ رستوں (Beated Trends) کو چھوڑ کر گلشنِ وطن کی آراستگی کا اہتمام کرنا ہے اور تمام انسانیت کو دلائل کے ساتھ پکارنا ہے: اُدْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً کہ تمام پورے پورے اسلام کے (دائرۂ امن) میں داخل ہوجاؤ! جس طرح شکاگو کے دس لاکھ ہپیوں نے جب مادی تہذیب اور تمام نشہ آور اشیاء کے استعمال اور جنسی آزادی کے باوجود قلبی سکون نہ پایا تو انہوں نے ۱۹۷۵ء کے اواخر میں اس صدی کا سب سے بڑا جلوس نکالا۔ ان کے ہاتھ میں کئی لاکھ بینرز تھے جن پر مرقوم تھا: "Back to Religion"[۱۰] (مذہب کی طرف واپس چلو)۔ آج ہمارے باشعور نوجوانوں کو تمام عالمِ اسلام میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً یہ صدا بلند کرنی ہے: پاکستان کے ہپیو اور خواتین دشمن اوباشو! کیا مغرب کے کروڑوں ہپیوں کا تجربہ تمہارے لئے کافی نہیں؟ کیا سوا لاکھ انبیاء کی تعلیمات کو تم ہذیان (نعوذ باللہ) سمجھتے ہو؟ کیا تم اسلام کی ان تعلیمات کی طرف نہیں آتے جس میں تمہاری دنیوی و اخروی حیات اور سکون ہے۔ آج میری بہنوں کو مغرب کی عریانی اور ان کی تہذیب و ثقافت کے پرکشش لیکن نقصان دہ نعروں سے بچ کر اسلام کی پاکیزہ تعلیمات پر عمل کرنا ہے اور اسلام کے نظامِ ستر و حیا اور عفت و عصمت پر عمل کرتے ہوئے بتولؓ، کلثومؓ، رقیہؓ اور مریمؑ کا کردار اپنے اندر پیدا کرکے حسینؓ، عبداللہؓ اور مسیحؑ جیسی ہستیوں کو جنم دینا ہے اور اسلامی نظامِ

---

۱۰۔ میری آخری کتاب ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم

ثقافت کو ایک دفعہ پھر اس کے حقیقی مقام تک پہنچانا ہے۔

## جنسی انارکی اور کلچر

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر جے ڈی انون (J.D.Unwin) نے برسوں جنس پر تحقیق کی اور یہ دیکھنے کے لئے کہ مرد و زن کے آزادانہ اختلاط اور بے لگام جذبۂ جنس کا اثر تہذیب پر کیا پڑتا ہے اس نے ۸۰ اقوام و قبائل کا بغور مطالعہ کیا اور پونے چھ سو صفحات کی ایک کتاب "Sex and Culture" کے عنوان سے لکھی۔ اس میں وہ کہتا ہے:

> "جنسیات اور کلچر کا آپس میں گہرا تعلق ہے' جذبۂ جنس پر قابو پانے کے بعد انسان میں ایک خاص توانائی پیدا ہوتی ہے جس سے معاشرے کے کسی بلند نصب العین کی تکمیل کا کام لیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ عیاشی و شہوت رانی میں پڑجاتے ہیں ان کی توانائی اتنی کم ہوجاتی ہے کہ وہ کوئی بڑا کارنامہ مثلاً ایجاد' تخلیق' تصنیف' تسخیر وغیرہ سرانجام نہیں دے سکتے۔ ان کے قوائے عمل پر اوس پڑ جاتی ہے اور ان کی تعبیرات و ذہانت دھندلا جاتی ہے۔ قدیم زمانے میں سمیریوں' بابلیوں اور مصریوں کا عروج اور ساتویں صدی میں قیصر و کسریٰ پر عربوں (مسلمانوں) کی یلغار سب اسی داخلی توانائی کا نتیجہ تھے۔ دوسری طرف جنسی آزادی تباہی لاتی ہے۔"

آگے وہ لکھتا ہے:

> "Any extension of sexual opportunity must always be the immediate cause of cultural decline"

یعنی جذبۂ جنس کی بے لگامی بلاشبہ ثقافت کے زوال کا سبب بن جاتی ہے۔[11] (فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ)

اس لئے ہماری نوجوان نسل کو (تمام اسلامی ممالک سے) تمام فحاشی کے اڈوں کو بند کرانا ہوگا اور غلط قسم کے ناولوں اور فلموں سے پرہیز ہی نہیں کرنا بلکہ انہیں ملک بدر

---

۱۱۔ Sex and Culture بحوالہ میری آخری کتاب ازبرق - جنسی آزادی کی تباہ کاریوں اور نقصانات (اور بیماریوں وغیرہ) کے لئے ملاحظہ ہو اگست ۱۹۸۲ء کا رسالہ "Time" اور پروفیسر [illegible] "Problems of Sex" [illegible]

بھی کرتا ہے اور "Platonic Love" کے کھوکھلے اور شیطانی ہتھکنڈوں سے بچ کر اسلامی روایات و اقدار جیسے نکاح وغیرہ کو فروغ دینا ہوگا اور دنیا کو ایک دفعہ پھر پاپ میوزک اور نورجہاں کے عشقیہ گانوں سے نکال کر سرودِ ازلی (Divine Music) کی طرف اس کی رہنمائی کرنی ہوگی جو دلوں کے لئے نور و سرور ہے اور قلب و نظر کو وہ پاکیزگی عطا کرتا ہے جس کی موجودہ زمانے کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

سنتے سنتے نغمہ ہائے محفلِ بدعات کو
کان بہرے ہوگئے دل بدمزہ ہونے کو ہے
آؤ سنوائیں تمہیں وہ نغمۂ مشروع بھی
پارہ جس کے لحن سے طورِ ہدیٰ ہونے کو ہے
حیف گر تاثیر اس کی تیرے دل پر کچھ نہ ہو
کوہ جس سے خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا ہونے کو ہے

اسلام نوجوان نسل کی طاقت کو ناجائز طریقوں میں استعمال سے بچانے کے لئے انہیں مختلف قسم کی کھیلوں اور جسمانی ورزش میں حصہ لینے کی تاکید کرتا ہے اور انہیں رائج الوقت کھیلوں میں شمولیت کی اجازت دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ ان کھیلوں سے جسمانی ورزش اور تفریحِ طبع کے ساتھ ساتھ اپنے اصلی مقصد سے غفلت نہ برتی جائے۔

اسلامی ثقافت میں عورت کے لئے بھی جسمانی ورزش اور کھیل میں حصہ لینے کی اجازت ہے جیسا کہ خود سیرتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس بارے میں ہدایت ملتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسلام کچھ حدود و قیود بھی مقرر کرتا ہے تاکہ بلند انسانی اقدار اور اعلیٰ بھی محفوظ رہیں۔ چنانچہ اسلامی ثقافت میں عورت کے لئے باہر کھلے میدانوں میں کرکٹ اور ہاکی کھیلنے کی کوئی سند جواز نہیں (جیسا کہ موجودہ دور میں ہو رہا ہے) بلکہ علیحدہ میدانوں اور باپردہ جگہوں پر انہیں کھیلنے کی اجازت ہے۔

## چند تجدد پسند تحریکیں اور ان کا مردانہ وار مقابلہ

آج ملت مسلمہ جن داخلی و خارجی سازشوں کا شکار ہے اس کا تقاضا ہے کہ نوجوان نسل (اپنے اسلاف کی طرح) ہر اس علمی و عملی اقدام کو سختی سے روکے جو ملتِ مسلمہ

کے لئے دینی اور اخلاقی فتنوں کا سامان مہیا کرے اور جس سے اس عظیم ملت کی مومنانہ و مجاہدانہ روح مجروح ہو۔ خواہ وہ فتنہ ضبطِ ولادت[۱۲](Birth.Control) کی شکل میں ہو یا عائلی قوانین (Family Laws) کی پرفریب شکل میں' یا تجدد' ترقی اور فیشن کے فکرانگیز نام سے یا اسلامی ریسرچ اور تحقیق کے نام پر تحریفِ دین کی تحریکوں کی صورت میں۔ اس مقصد کے لئے آج نوجوان نسل کو ملتِ مسلمہ کے اندر کسی "منظم علمی تنظیم" کے ذریعے پختہ دینی شعور اور اسلام سے گہری وابستگی پیدا کرنی ہوگی تاکہ باطل جس لبادے میں ملبوس ہو کر آئے (جیسے خدمت دین کے نام پر تجدد پسند اور نیچری فرقہ' منکرینِ حدیث کا گروہ' انکار و توہینِ صحابہؓ کا فرقہ' بہائیت یا سب سے بڑا فتنہ قادیانیت) عوام اسے پہچان لیں اور اس کی ظاہری چمک دمک اور پرفریب ناموں سے دھوکہ نہ کھائیں اور یہ کہہ سکیں۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

## اسلام کے اقتصادی نظام کا نفاذ اور فتنۂ ارتداد سے حفاظت

عصر حاضر میں اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ نوجوان نسل اسلام کے اقتصادی نظام کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کرکے اسے عملی طور پر نافذ کرنے کی کوشش کرے اور یوں ایک طرف وہ مسلمانوں کو فتنۂ ارتداد (عیسائیت کے مبلغ اور پادری غرباء مسلمانوں کو دولت کا سبز باغ دکھاکر اپنے دامِ تزویر میں پھنسالیتے ہیں) اور دیگر معاشرتی برائیوں سے بچائیں تو دوسری طرف تمام دنیا کو عملی طور پر دکھاسکیں کہ اسلام صرف عقائد و عبادات ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات (Complete Code of Life) ہے جو زندگی کے تمام شعبہ جات پر محیط ہے۔

---

۱۲۔ ضبط ولادت کے نقصانات کے لئے ملاحظہ ہو مولانا مودودی کی کتاب "اسلام اور ضبط ولادت" اور مولانا سمیع الحق کی "اسلام اور عصر حاضر" کا باب نمبر۴

۱۳۔ تجدد (تحریف دین) اور تجدید (مذہب کو غلط رسوم سے پاک کرکے دور حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر تشریح کرنا) کے مابین فرق کے لئے ملاحظہ ہو "مذہب اور تجدید مذہب" عبدالحمید صدیقی اور شاہ ولی اللہ کی "حجتہ اللہ البالغہ"

# جدید صنعتی اور جنگی تیاری

ثقافتِ اسلامیہ کے آئینے میں نوجوان نسل کے کردار کے بارے میں ابھی تک راقم الحروف نے جو لکھا ہے وہ صرف علمی و معنوی اور شعوری تیاری کے بارے میں تھا۔ اگرچہ اسلام میں علمی و قلمی جہاد کی بہت اہمیت ہے لیکن اس کے ساتھ وہ مادی ترقی سے بھی اغماض نہیں برتتا بلکہ مسلمانوں کو اس سرزمین میں اللہ کا خلیفہ قرار دے کر اسے حکومتِ ارضی سونپنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے وہ مسلمانوں کو حکم کرتا ہے کہ ممتاز قوت حاصل کریں اور صنعت و علومِ تجارت اور فنِ حرب میں مکمل تیاری کرکے ان کافروں کے مقابلے میں قوت فراہم کریں اور پھر اس کے ذریعے بے بس مردوں' عورتوں اور بچوں کی خاطر قتال کرکے انہیں ظلم و بربریت سے نجات دلائیں[۱۴]

اس لئے آج مسلمان نوجوانوں کو اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے صنعتی علوم و فنون جدید ٹیکنالوجی اور آلاتِ حرب میں سپرپاورز (روس و امریکہ) کے شانہ بشانہ بلکہ ان سے بھی آگے بڑھنا ہے۔ اپنی زندگی کے معاملات کا انتظام خود کرنا ہے۔ اپنی زمین کے خزانے خود برآمد کرنے ہیں اور جدید قسم کے ساز و سامان سے لیس ہوکر کافروں پر اپنی دھاک بٹھانی ہے۔ کیونکہ اس وقت خلافتِ ارضی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کا مادی حصہ غیروں کے قبضے میں اور صرف اس کا روحانی حصہ اہلِ اسلام کے پاس ہے۔ جب تک یہ دونوں یکجا نہیں ہوجاتے مسلمانوں کی نشأۃِ ثانیہ ممکن نہیں ہوسکتی اور دنیا اپنی تہذیبی و تمدنی ہلاکت خیزیوں کے مہیب غار سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ اس لئے مسلمان نوجوانوں پر یہ فرض ہے کہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے جدوجہد کریں اور تمام گروہی' لسانی' علاقائی' فروعی اور آپس کے افتراق و تشتت کو ختم کرکے متحد ہوجائیں اور

ع "شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیراللہ کو"

کے مصداق قرونِ اولیٰ والے مسلمانوں کا جذبۂ جہاد پیدا کرکے کفر و باطل اور فتنہ و فساد کو مٹادیں اور **قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ**[۱۵] (القرآن) پر عمل کرتے

---

۱۴۔ سورۃ النساء' آیت ۷۵

۱۵۔ سورۃ الانفال' آیت ۳۹

ہوئے اپنے مظلوم بھائیوں کو غیروں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلادیں' وہ مسلمان بھائی چاہے فلسطین' لبنان کے ہوں یا افغانستان و جموں و کشمیر کے یا افریقہ کے سیاہ فام ہوں یا ہندوستان کے مسلمان بھائی ہوں۔

یا الٰہی ملتِ مسلم کو زندہ پھر سے کر
اس میں یا رب بت شکن محمود پیدا پھر سے کر

## نوجوان نسل کا اہم ترین کردار اسلامی ثقافت کے آئینے میں

امام مالکؒ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ قول نقل کیا ہے: **لَنْ یَصْلُحَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا** یعنی امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم جب آخر میں ضلالت و گمراہی کی غاروں میں بھٹک رہی ہوگی تو اس وقت اس کی اصلاح اسی نہج پر ہوگی جس نہج پر ابتدا میں اس کی اصلاح ہوئی تھی (یعنی ایک مردِ مومن کے ذریعے جو اسوۂ رسولؐ پر مکمل طور پر عمل کرنے والا ہوگا) آج تمام عالم کو عموماً اور عالمِ اسلام کو خصوصاً ایسے باہمت نوجوانوں کی ضرورت ہے جو قرآنی تعلیمات کے ذریعے اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اس کی اس کڑے اور مشکل وقت میں رہنمائی کریں۔ وہ مردِ مومن عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ**[16] پورا اترتے ہوئے ایسا انقلاب لائیں جو انقلابِ محمدیؐ کی طرح کا ہو۔ ایسے نوجوان تمام مغربی علوم و فنون اور تمدن کے ساتھ خام مواد (Raw.Material) کا سا معاملہ کریں اور اس کے صالح اجزاء کو کام میں لاکر ایک ایسی نئی طاقتور تہذیب کی عمارت تعمیر کریں جو ایک طرف ایمان' اخلاق' تقویٰ' رحم دلی اور انصاف پر قائم ہو تو دوسری طرف اس میں مخصوص ذہانت' جدتِ فکر اور قوتِ ایجاد جلوہ گر ہو۔ وہ کمال سے جمال تک کے تمام تجدد پسند لیڈروں کی طرح مغربی تہذیب کو کامل و مکمل نہ سمجھیں اور اسے اس کے تمام عیوب و نقائص سمیت قبول نہ کریں بلکہ "**خُذْ مَا صَفَا دَعْ مَا کَدَرْ**" کا زریں اصول اپناکر اپنے اسلاف کی طرح اسے ایک نیا ایمانی رنگ عطا کریں (جس طرح انہوں نے ایرانی اور رومی تہذیب کے ساتھ کیا تھا) آج یہ دور ایسے مجاہدین کی تلاش میں ہے اور انہیں پکار پکار کر یہ کہہ رہا ہے۔

---

۱۶۔ سورۃ الانفال' آیت ۶۰

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ
معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز!
از خوابِ گراں' خوابِ گراں' خوابِ گراں خیز!
از خوابِ گراں خیز ! !

میری دانست میں اس وقت اسلامی تہذیب و ثقافت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہو گا کہ عالمِ اسلام کے کسی ملک[۱۷] سے ایسی جواں ہمت جماعت اٹھے جو قوتِ ایمانی سے لبریز' جدید اسلحہ سے لیس[۱۸] مغرب پر بھروسہ کئے بغیر پہلے اپنے ملک میں اسلامی بنیادوں پر انقلاب برپا کرے اور پھر پورے عالمِ اسلام سے افہام و تفہیم کے بعد ایک ایسا اسلامی بلاک تیار کرے جس کے سامنے امریکہ اور روس کیا پورا عالمِ کفر نہ ٹھہر سکے۔ کیونکہ عالمِ اسلام یا اس کے کسی حصہ نے بھی جب کبھی کفر و مادیت پرستی کے دعویداروں پر بھروسہ کیا تو ہمیشہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا' ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ اور ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ نے حدیث رسولؐ کی حقانیت کے اطلاق کو روزِ روشن کی طرح ظاہر کردیا کہ اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ (تمام کفر ایک امت ہے)۔ اس وقت دنیا ان مادیت پرستوں کے عدل و انصاف اور امن و امان قائم کرنے کے جوشیلے مگر جھوٹے دعووں سے ناامید ہو چکی ہے اور اسے پورا یقین ہو چکا ہے کہ انسانیت کی مشکل کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ عالمگیر قیادت ان مجرم اور انسانیت کے خون سے رنگین ہاتھوں سے نکل کر' جنہوں نے انسانیت کو غرق کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے' ان امانت دار' فرض شناس' خدا ترس اور تجربہ کار ہاتھوں کی طرف منتقل ہو جو انسانیت کی جہاز رانی کے لئے روزِ اول سے بنائے گئے ہیں۔ نتیجہ خیز اور کارآمد انقلاب صرف یہ ہے کہ دنیا کی رہنمائی اور انسانیت کی

---

۱۷؎ یہ ملک پاکستان ہی ہونا چاہئے کیونکہ اس کے قیام کا مقصد ہی اسلامی تہذیب و ثقافت کا احیاء تھا۔

۱۸؎ ہمارے نزدیک آج کے دور میں کسی مسلمان ملک میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے ایک ایسی مضبوط دینی جماعت جس کے ارکان خود اپنے وجود پر اسلام کو نافذ کر چکے اور تربیت کے مرحلے سے گزر چکے ہوں' یقیناً ناگریز ہے تاہم ہماری رائے میں انقلاب کے آخری مرحلے میں دو طرفہ مسلح تصادم کی نوبت نہیں آئے گی بلکہ اقدام کے مرحلے پر بھی صبر محض' ہی فیصلہ کن ثابت ہو گا۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے "منہج انقلاب نبوی" از ڈاکٹر اسرار احمد (ادارہ)

سربراہی جاہلیت کے کیمپ سے جس میں برطانیہ، امریکہ، روس اور اس کی حاشیہ بردار مشرقی اور ایشیائی قومیں ہیں اور جس کی زمامِ قیادت مترفین اور اکابر مجرمین کے ہاتھوں میں ہے، منتقل ہوکر اس امت کے ہاتھ آجائے جس کی قیادت معمارِ اعظم رحمتِ عالم محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے اور جو دنیا کی تعمیر اور انسانیت کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے محکم اور واضح اصول و تعلیمات رکھتی ہے اور جس کا ایمان دنیا کو اس وقت کی جاہلیت سے اس طرح نکال سکتا ہے جس طرح چودہ سو سال پہلے نکالا تھا۔[19]

## نوجوان نسل کے لئے پیغام

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے

اگر نوجوان نسل پوری تندہی اور خلوصِ دل کے ساتھ زندگی کے مختلف میدانوں میں مذکورہ بالا کردار ادا کرے تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ ملتِ اسلامیہ جلد ہی اپنے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ بحال کرسکے گی اور **وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا**[20] کا سماں ہوگا۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

آج بھی نوجوان نسل (بلکہ پوری امتِ مسلمہ) کے لئے وہی ایمان افروز پیغام ازلی و ابدی ہے جس سے قرنِ اول کے مسلمان آشنا ہوئے:

"محنت (مجاہدہ) کرو اللہ کی راہ میں جیسی کہ چاہئے اس کے واسطے

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

---

۱۹۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، ص ۴۰۱، ۴۰۲ از سید ابوالحسن علی ندوی
۲۰۔ سورۃ النصر

# قصص القرآن

## ایک تحقیقی مطالعہ (۲)

—— علامہ شبیر بخاری ——

○ کتاب پیدائش کی رو سے حضرت آدمؑ کے بعد حضرت شیثؑ نے ۲۹۶۲ میں خرقہ رشد و ہدایت اختیار کیا، پھر ان کی نسل میں انوش، قینان، ہلاکل، جارد، اخوج، میمتو شلح اور لامک کے نام ملتے ہیں اور حضرت نوحؑ انہی لامک کے فرزندِ ارجمند تھے۔ آپ کا نام یشکر تھا یا ایک اور لغت میں عبدالغفار کا ہم معنی تھا۔ آپ کو ابوا لبشر ثانی بھی کہتے ہیں۔ نوح اس لئے کہا گیا کہ وہ اپنے دور کے انسانوں کے دکھوں اور گناہوں پر اکثر نوحہ خواں رہتے تھے۔ ان کے دور کے حالات کے سلسلے میں انجیل کتاب پیدائش باب ۶ آیت ۹ میں ہے: The earth was filled with violence

○ قرآن مجید میں سورۂ نوح میں ہے: **قَالَ نُوحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗ اِلَّا خَسَارًا وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا** اور پھر بددعا کی کہ **رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا** — اس پر ارشاد ربانی ہوا کہ ایک سفینہ بناؤ جس میں ہر نوع کی مخلوق کا ایک ایک جوڑا رکھ لو۔ اور پھر سطحِ ارضی پر سیلاب آیا اور اس نے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلائی۔ دنیا کی اکثر کتبِ قدیمہ میں اس طوفان کا ذکر ملتا ہے۔ بائبل کی رو سے یہ طوفان ۲۹۰۰ ق م میں آیا۔

طوفان تھما تو سفینۂ نوحؑ الجودی ارارات (جبل وام کے جنوب مغرب میں) پر رک گیا۔ روایت ہے کہ چالیس دن اور چالیس رات مسلسل پانی برسا اور اس وقت کی مخلوقاتِ ارضی میں صرف وہی مخلوق سلامت رہی جو حضرت نوحؑ کے ساتھ تھی۔ قرآن مجید میں ہے کہ: **فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ** (الشعراء: ۱۱۹) حضرت نوحؑ کی بے وفا بیوی وا ملہ اور نافرمان بیٹا کنعان بھی طوفان کی نذر ہو گئے۔ قرآن مجید میں باپ بیٹے کا مکالمہ باہمی اور باپ کا اللہ تعالیٰ سے استغاثہ بھی ملتا ہے۔ جب بیٹا عالم بے چارگی میں

گھر گیا تو باپ نے اپنے معزل بیٹے سے کہا کہ : یٰبُنَیَّ ارْکَبْ مَّعَنَا کہ اے بیٹے ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا لیکن اس نے کہا کہ : سَاٰوِیْ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ میں پہاڑ کی طرف ہو لیتا ہوں جو پانی سے مجھے بچا لے گا۔ باپ نے کہا : بیٹے لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اور پھر وَ حَالَ بَیْنَھُمَا الْمَوْجُ فَکَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ(ہود : ۴۲) -- پھر قرآن مجید میں باپ کا استغاثہ ان الفاظ میں ہے کہ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَھْلِیْ کہ پاک پروردگار میرا بیٹا میرے گھر والوں ہی سے ہے وَ اِنَّ وَعْدَکَ الْحَقُّ اور تیرا وعدہ سچا ہے کہ تیرے اہل بیت کی حفاظت ہوگی۔ اس پر ارشاد ہوا کہ یٰنُوْحُ اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ اے نوح یہ تیرے اہلیت میں سے نہیں ہے' اس کے اعمال صالح نہیں ہیں (ہود :۴۶)

اس سے اسلام کے تصورِ صالحیت کی بڑی خوبی سے وضاحت ہوئی کہ ع بندگی باید پیمبر زادگی مقصود نیست -- آج اولیاء اور صالحین کے تاریخی شہر ملتان میں حضرت نوحؑ کے وقت کی طرح کے طوفان کے موقع پر اربابِ خیر کے لئے لمحۂ فکریہ ہے کہ۔

پسرِ نوح بابداں بہ نشست  خاندانِ نبوتش گم شد

○ آج ہر سید' مخدوم' قریشی' ہاشمی' گیلانی' بخاری کو صدقِ دل سے محسوس کرلینا چاہئے کہ

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی
کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

○ قرآن مجید میں حضرت نوحؑ کی قوم کو قوم سَوءٍ کہا گیا ہے جو حضرت نوحؑ کی عظمتِ نبوت کی قائل نہ تھی' ود' سواع' یغوث' یعوق اور نسر جیسے پرانے بزرگوں کے بت بنا کر اسے پوجتی تھی اور ان کے لئے الگ الگ عبادت گاہیں تعمیر کرتی تھی۔ یہ قوم معصیت کوش تھی اور شریعت الٰہی کو قبول کرنے سے ہچکچاتی تھی اور ٹال مٹول اور حیلہ سازیوں سے کام لیتی تھی وَمَکَرُوْا مَکْرًا کُبّٰرًا۔

قرآن مجید میں حضرت نوحؑ کی عبودیت حقہ (القمر) نذرات مبینہ (نوح' ہود) اور محسنیت تامہ (صفت) کا اعتراف ہے۔ انہیں آیت للعالمین (العنکبوت) مستجاب الدعوات (الانبیاء) رسول من رب العالمین (الاعراف) مخلص' موحد' ناصح' مشفق اور ہادیٔ برحق

قرار دیا ہے اور سَلٰمٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ (الصّٰفّٰت) کی سندِ عظمتِ رسالت عطا فرمائی ہے۔ لیکن بڑی حیرت اور بڑے تعجب کی بات ہے کہ عیسائیوں کی اسفارِ محرفہ میں اس معتم بالشان نبی کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اور ان کی پاکیزہ زندگی کو داغدار بنانے کی بڑی گھناؤنی سازش کی گئی ہے۔ پیدائش باب ۶ آیت ۹ میں تو کہا گیا کہ:

Noah was a righteous man. He proved himself faultless among his contemporaries. Noah talked with the true God.

لیکن باب ۹ کی آیات ۲۱، ۲۲ یوں ہیں:

And he began drinking of the wine and became intoxicated himself in the midst of his tent. Later Haw the father of Canaan saw his father's nakedness and went telling it to his true brothers outside. (Genesis 9: 21-22)

○ پھر بیٹوں نے اپنے باپ کی عریانی کو ڈھانپا لیکن جب حضرت نوحؑ کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو انہوں نے کہا:

Cursed be Canaan. Let him become the lowest slave to his brothers.

○ باب پیدائش میں حضرت نوحؑ کی عمر ۹۰ سال لکھی گئی ہے اور The.World.in.Collision کے روسی مصنف نے ثابت کرنا چاہا ہے کہ ان دنوں سال ایک ماہ کے عرصے پر بھی شمار ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے ان کی عمر آج کے کیلنڈر کے مطابق ۷۹ / ۸۰ سال بنتی ہے اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔

○ پرانے اور نئے عہدناموں میں کتاب پیدائش، خروج، اسموئیل، ۲ سموئیل، سلاطین، احبار، گنتی، استثناء، صحیفۂ ایوب، صحیفۂ یوحنا، لوقا، متی، تاریخ اور باقی ابواب میں ادریسؑ، لوطؑ، ہودؑ، ابراہامؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، موسیٰؑ، ایوبؑ، زکریاؑ، عیسیٰؑ اور دیگر انبیاء کے حالات مذکور ہیں لیکن ان میں عوامی قصہ گوئی کا بازاری رنگ جابجا اتنا گہرا ہے کہ ان کی پیغمبرانہ عظمت قدم قدم پر مجروح ہوتی ہے۔ تفصیلات کا

احاطہ تو ایک مبسوط کتاب میں ہی ممکن ہے' مختصراً چند اشارات ملاحظہ ہوں۔

قرآن مجید میں حضرت لوطؑ کے بارے میں صراحت سے کہا گیا ہے کہ وہ مرسلین میں سے تھے (صافات)' انہوں نے اپنی امرد پرست اور ہم جنسیت گزیدہ قوم کی تنذیر کی' ان کی سرکشی پر انہیں تعذیب ہوئی' پتھر برسے' شکرانِ نعمت کے سبب آلِ لوط کو بچالیا گیا (القمر)۔ فواحش کی پستیوں میں گری ہوئی قوم کو حضرت لوطؑ نے انتباہ کیا اور جب ان کی نافرمانیوں کی انتہا ہوگئی تو لوطؑ نے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی۔ فرشتوں نے بشارت دی کہ گھبراؤ نہیں' نہ ہی رنجیدہ ہوجاؤ اِنَّا مُنَجُّوْکَ وَاَھْلَکَ ہم تمہیں اور تمہارے اہل کو بچالیں گے (العنکبوت) اور النجم' النمل' الشعراء' الفرقان' الانبیاء الحجر' ہود اور الاعراف میں ان کا ذکر بڑے احترام سے کیا گیا ہے۔ سورۂ ہود میں "ھٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ" میں "میری بیٹیوں" سے مراد "میری قوم کی بیٹیاں" ہیں۔ اسی طرح جہاں ان کی بیوی (غالباً اوالہ) کی بے وفائی کا ذکر ہے وہاں یہ بھی وضاحت ہے کہ وہ بھی کافروں کے ساتھ رہنے والوں میں رہ گئی (الشعراء)۔ اس سارے قصے میں کسی مقام پر بھی حضرت لوطؑ کی پیغمبرانہ وجاہت' پاکباز سیرت اور عظمتِ رسالت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ لیکن بائبل کے قصہ گووں نے کتاب پیدائش باب ۱۹ کی آیات ۳۰ تا ۳۸ میں حضرت لوط اور ان کی بیٹیوں کے بارے میں ایک ایسا ناپاک افسانہ گھڑا ہے کہ اس سے انسانی شرافتوں کا دیوالہ پٹ گیا ہے اور انسانی عفت و حیاء کا جنازہ نکل گیا ہے۔ پرانے عہد نامے (شائع کردہ پاکستان بائبل سوسائٹی) لاہور مطبوعہ ۱۹۶۵ء) میں صفحہ ۱۹ پر وہ قصہ مذکور ہے جس کو نقل کرنے کی ہمارے اندر تاب نہیں۔ باپ بیٹی کے نہایت درجہ مقدس رشتے پر جو داغ وہاں لگایا گیا ہے' شاید سگمنڈ فرائیڈ بھی یہ کچھ نہ کرپایا ہو۔

سدوم کی نسبت سے Sodomy بائبل میں بھی فعل مذموم قرار دیا گیا تھا لیکن دنیائے مسیحیت کی ممتاز ملکہ الزبتھ کے دورِ حکومت میں ایسا بھی ہوا کہ ایک باقاعدہ ایکٹ (Homo Sexualty Act. 1967) کی رو سے اس گھناؤنے جرم کو جواز فراہم کردیا گیا۔ حضرت لوطؑ کی تعلیمات کی اس سے بڑھ کر اور کیا تضحیک ہوسکتی ہے؟

○ حضرت یعقوبؑ کا سورۂ یوسف اور دیگر آیاتِ قرآنی میں ایک جلیل القدر پیغمبر کا بطور ایک صابر' شکرگزار' مشفق باپ کا کردار ابھرتا ہے جس نے اپنے بیٹے کو مطلع کیا کہ

یَجْتَبِیکَ رَبُّکَ وَیُعَلِّمُکَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ وَیُتِمُّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکَ وَعَلٰی اٰلِ یَعْقُوْبَ کَمَا اَتَمَّھَا عَلٰی اَبَوَیْکَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰھِیْمَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبَّکَ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ (یوسف : ۵ - ۶) کہ تو اپنے رب کا مجتبیٰ ہوگا' تمہیں تاویل الاحادیث کا علم عطا ہوگا اور تجھ پر اور میری آل پر اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اتمام ہوگا جس طرح تیرے اجداد ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ پر قبل ازیں ہوا تھا۔ پھر اس اَبًا شَیْخًا کَبِیْرًا کا وہ مقام شکر و امتنان سامنے آتا ہے کہ اِنَّمَآ اَشْکُوْ بَثِّیْ وَ حُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ اور پھر حضرت یوسفؑ کا وہ اکرامِ والدین کا لافانی مظاہرہ وَ رَفَعَ اَبَوَیْہِ عَلَی الْعَرْشِ اور یہ پورا قصہ احسن القصص انسانیت کبریٰ کی اقدارِ اعلیٰ کی بڑی ہی خوبصورتی سے محافظت کرتا ہے اور ہر پیغمبر مینارۂ نور کی طرح اپنے دور کے انسانوں کے سفینہ ہائے حیات کی رہنمائی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

○ برخلاف ازاں عہد نامہ قدیم کا یعقوب اپنی دونوں بیویوں سے جو آپس میں سگی بہنیں ہیں شکایت کرتا ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے باپ کا رخ پہلے سے بدلا ہوا ہے میرے باپ کا خدا میرے ساتھ رہا ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ میں نے اپنے مقدور بھر تمہارے باپ کی خدمت کی ہے لیکن تمہارے باپ نے مجھے دھوکہ دے دے کر دس بار میری مزدوری بدلی ... (لابن کی بیٹیوں نے کہا) اس نے ہم کو بھی بیچ ڈالا اور ہمارے روپے بھی کھا بیٹھا ..... سو راخل اپنے باپ کے بتوں کو چرا کر لے گئی اور یعقوب بھی لابن ارامی سے چوری چلا گیا ..... لابن نے سات منزلوں پر اسے جا پکڑا وغیرہ وغیرہ' (پیدائش باب ۳۱) اور چھپ کر بھاگنے اور بتوں کے چرانے پر اسے مطعون کیا۔ پھر ایک عجیب و غریب من گھڑت کہانی ہے کہ یعقوب دونوں بیویوں' دونوں لونڈیوں (اور ان کے بارے میں بھی لغو روایات ہیں) اور گیارہ بیٹوں کو ساتھ لیکر چلا' سب کو یبوق کے گھاٹ کے پار اتارا اور خود اکیلا رہ گیا۔ وہ رات بھر ایک شخص کے ساتھ کشتی لڑتا رہا اور یعقوب اس پر غالب رہا ---- پھر اس شخص نے یعقوب کی ران کو اندر سے چھوا اور یعقوب کی ران اس کشتی کرنے میں چڑھ گئی اور اس نے کہا مجھے جانے دے کیونکہ پو پھٹ چلی ہے۔ یعقوب نے اس سے برکت مانگی۔ اس نے نام پوچھا۔ اس نے یعقوب بتایا تو اس نے کہا تیرا نام آگے کو یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا ---- گویا کشتی میں فریق ثانی خدا تھا اور یعقوب نے اس پر فتح پائی (لاحول

ولاقوۃ) -- پھر مذبح بنانے' ختنہ' لڑکیوں کی مباشرت' یعقوب کی بیٹیوں کے معاشقے اور نہ جانے کیا کیا Myths اکٹھی کی ہیں اور ان کا معاشرۂ انسانی کی تعمیر و تشکیل میں کیا دخل ہے قصہ گوؤں کو ہی علم ہوگا۔

○ حضرت داؤدؑ کو (سورۂ سبا آیت ۱۰: **وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا**) اللہ نے برتری اور فضیلت بخشی اور پہاڑوں اور پرندوں کو ان کے لئے مسخر کردیا' ان کے لئے لوہے کو نرم کردیا تاکہ بآسانی زرہیں بناسکیں۔ حضرت داؤدؑ "ذوالاید" (صاحبِ قوت) تھے اور "اواب" بھی (رجوع الی اللہ کرنے والے) اور پرند ان کے "اواب" (فرماں بردار) تھے۔ ان کی بادشاہی مستحکم تھی (**شَدَدْنَا مُلْكَهٗ**) اور وہ صاحب حکمت تھے (**اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ**) وہ دو ٹوک فیصلہ کرنے کی صلاحیت کے مالک تھے (**فَصْلَ الْخِطَابِ**) اور ان کی عدل گستری کا واقعہ بھی ذکر کیا گیا ہے۔ انہیں منطق الطیر سکھائی گئی' صنعتِ لبوس سے سرفراز ہوئے اور ان کا اور حضرت سلیمان کا اعتراف ہے کہ: **قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ** (النمل) -- اور البقرہ' الانبیاء' ص اور جہاں کہیں بھی ان کا ذکر آیا ہے اس سے ان کی عظمتِ رسالت کا ہر نقش نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن برخلاف ازاں بائبل ۲ سموئیل ب ۶ داؤد کو ساؤل کی بیٹی نے خداوند کے حضور اچھلتے ناچتے دیکھا' داؤد نے آج کے دن اپنے ملازموں کی لونڈیوں کے سامنے اپنے کو برہنہ کیا جیسے کوئی بانکا بے حیائی سے برہنہ ہوجاتا ہے۔ ان کے کردار کو داغ دار بنانے کے لئے یہ قصہ بھی "زیبِ داستان کے لئے کچھ بڑھالینے" کی بے حد شرمناک مثال ہے (سموئیل باب گیارہ (۲۷-۲) ملاحظہ ہو:

> "اور شام کے وقت داؤدؑ اپنے پلنگ پر سے اٹھ کر بادشاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگا اور چھت پر سے اس نے ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی اور وہ عورت نہایت خوبصورت تھی۔ تب داؤد نے لوگ بھیج کر اس عورت کا حال دریافت کیا اور کسی نے کہا کیا وہ العام کی بیٹی بت سبع نہیں جو حلی اوریاہ کی بیوی ہے اور داؤد نے لوگ بھیج کر اسے بلالیا اور وہ اس کے پاس آئی اور اس نے اس سے صحبت کی کیونکہ وہ اپنی ناپاکی سے پاک ہوچکی تھی"۔

بعدازاں واقعہ آگے چلتا ہے تاآنکہ اوریاہ کو میدان جنگ میں بھیج دیا جاتا ہے اور یوآب کو لکھا جاتا ہے کہ اوریا کو گھمسان میں سب سے آگے رکھنا اور تم اس کے پاس سے ہٹ

جانا تاکہ وہ مارا جائے(۱۶)۔ جب اوریاہ کی بیوی نے سنا کہ اس کا شوہر مرگیا تو وہ شوہر کے لئے ماتم کرنے لگی اور جب سوگ کے دن گزر گئے تو داؤد نے اسے بلوا کر اپنے محل میں رکھ لیا اور وہ اس کی بیوی ہوگئی۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)

ہمارے بعض غیرمحتاط مفسرین نے سورۂ ص کی دنبیوں والی آیت کی حکایت اسرائیلیات کے اس لغو افسانے سے جوڑنا چاہی ہے' حالانکہ اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دو مستفسرین کے سوالات ان کے اپنے مسائل سے متعلق تھے اور حضرت داؤد کا استغفار اس بناء پر تھا کہ انہوں نے فریقین کی بات سننے سے پہلے قطعیت پر پہنچنے کی کوشش کی۔ قرآن مجید کے قصص میں حضرت داؤدؑ کے کردار پر کوئی حرف نہیں آتا۔

سب سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ بائبل کے قصہ گوؤں کی دست برد سے حضرت عیسیٰؑ کی ذات گرامی بھی محفوظ نہیں رہی۔

○ متی ب۱ کی رو سے یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابرہام کا نسب نامہ یوں ہے:

ابرہام سے اضحاق پیدا ہوا اور اضحاق سے یعقوب پیدا ہوا اور یعقوب سے یہوداہ اور اس کے بھائی پیدا ہوئے اور یہوداہ سے فارص اور زارح تمر سے پیدا ہوئے اور فارص سے حصرون پیدا ہوا اور حصرون سے رام پیدا ہوا اور رام سے عمیناداب پیدا ہوا اور عمیناداب سے نحسون پیدا ہوا اور نحسون سے سلمون پیدا ہوا اور سلمون سے بوعز راحب سے پیدا ہوا اور بوعز سے عوبید روت سے پیدا ہوا اور عوبید سے یسی پیدا ہوا اور یسی سے داؤد بادشاہ پیدا ہوا اور داؤد سے سلیمان اس عورت سے پیدا ہوا جو پہلے اوریاہ کی بیوی تھی..... اور پھر یہ سلسلہ آیت ۱۶ تک جاتا ہے کہ اور یعقوب سے یوسف پیدا ہوا' یہ مریم کا شوہر تھا۔

اس سلسلۂ نسب میں جن نشان کردہ تین خواتین کا نام آیا ہے بائبل کی رو سے

(۱) تمریا تامار (پیدائش ب۳۸' ۱۹ - ۱۳) یہوداہ کی بہو تھی جو برقع اوڑھ کر تمنت کی راہ پر جا بیٹھی۔ یہوداہ نے اس سے کہا ذرا مجھے اپنے ساتھ مباشرت کرنے دے۔ وہ مان گئی۔ خسر سے مباشرت کے بعد اس سے بچہ پیدا ہوا۔

(۲) راحب (یشوع ب۲) شطیم کے دو مرد ایک کسبی کے گھر جس کا نام راحب تھا آئے اور وہیں سوئے۔

(۳) اوریاہ کی بیوی ۲ سموئیل (ب۱۱، ۵ - ۲)- داؤد نے لوگ بھیج کر اسے بلا لیا، وہ اس کے پاس آئی، اس نے اس سے صحبت کی۔

○ قصص القرآن کا مزاج پاکیزہ ہے۔ ان میں زندگی کی اونچی سے اونچی قدروں کی عکاسی ہے، اور وہ بلاشبہ Imaginative expression of basic truth کی اساس ہیں۔ البتہ جس مذہب کے پیرو اپنے پیغمبروں کے بارے میں قصے بیان کرنے میں صداقتوں سے اس درجہ تہی دامن ہوں تو نہ تو انہیں حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیمٍ کی رفعتوں کا ادراک ہو سکتا ہے اور نہ ہی ان کی رحمۃ للعالمینی اور خاتم النبیینی تک رسائی ممکن ہے۔ قصص القرآن کا انسانیتِ کبریٰ کی اقدارِ عالیہ پر یہ سب سے بڑا احسان ہے کہ انہوں نے انبیاء و مرسلین کی پاکیزہ زندگیوں سے وہ گرد جھاڑ دی ہے جو غیرذمہ دارانہ قصہ گوئی نے ان کی شخصیتوں پر ڈالنے کی نامسعود کوشش کی۔ الحمد للہ العلی العظیم!!

لَن یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُومُھَا وَلَا دِمَاؤُھَا وَلٰکِن یَّنَالُہُ التَّقوٰی مِنکُم
(الحج - آیت ۳۷)
اللہ تک تمہاری قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا مگر تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔
قربانی ہماری معاشرتی رسم ہے یا دینی فریضہ!
عید الاضحیٰ کے مبارک موقع پر قربانی کے ساتھ
قربانی کی روح اور مقاصد کو سمجھنے کے لیے
امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی تالیف
عید الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی
کا مطالعہ ضرور کیجئے
• سفید کاغذ • رنگین سرورق • ۴۸ صفحات • قیمت -/۶ روپے
قریبی بکسٹال سے خریدیئے یا ہم سے منگوائیے!
مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶ - K ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

# سورۃ البقرۃ (۲۸)

## آیات ۴۰ — ۴۱

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳، اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے مثلاً ۲ : ۵ : ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۲۸ يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ
اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ
بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝ وَاٰمِنُوْا بِمَآ
اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ
كَافِرٍۢ بِهٖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا
وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝ ۴۱

## ۲ : ۲۸ : ۱ اللغۃ

**۲ : ۲۸ : ۱ (۱)** [يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ] جسے عام رسم املائی میں "یا بنی اسرائیل" لکھا جاتا ہے۔ یہ تین کلمات "یا"، "بنی" اور "اسرائیل" کا مرکب ہے۔ اس میں "یا" تو نداء کا ہے جس کا عام اردو ترجمہ "اے" ہے۔ عربی حروفِ نداء اور ان کے استعمال پر البقرہ : ۲۱ یعنی ۲ : ۱۶ : ۱ (۱) میں مفصل بات ہوئی تھی۔

● "بَنِىْ" دراصل "بَنِيْنَ" تھا مگر آگے مضاف ہونے کے باعث آخری نون (اعرابی) گر کر "بَنِىْ" رہ گیا ہے اور یہ "بَنِيْن" بھی دراصل "بَنُوْنَ" کی حالتِ نصب ہے (جس کی وجہ "الاعراب" میں بیان ہوگی) اور "بَنُوْنَ" لفظ "اِبْنٌ" کی جمع مذکر سالم ہے [جو صحیح معنوں میں تو جمع سالم نہیں ورنہ "اِبْنُوْنَ" ہوتی۔ تاہم آخر کی اعرابی علامت "ـُـوْن" یا "ـِـيْنَ" کی وجہ سے یہ بھی جمع سالم ہی شمار ہوتی ہے]۔

● لفظ "اِبْنٌ" کا مادہ "ب ن ی" ہے۔ اگرچہ بعض نے اس کا مادہ "ب ن و" قرار دیا ہے[1] اس کی اصلی شکل "بَنَوٌ" یا "بَنَیٌ" بروزن "فَعَلٌ" تھی پھر آخری "یاء" یا "واو" کو ثقیل سمجھ کر گرا دیا گیا۔ اور اس کے عوض شروع میں ھمزۃ الوصل لگا دیا گیا (جو بصورت وصل تلفظ سے ساقط ہو جاتا ہے)۔ اسی قسم کا عمل لفظ "اسمٌ" میں بھی ہوا ہے۔ دیکھئے سورۃ الفاتحہ میں بحث بسم اللہ [۱ : ۱ : ۱ (۱)] اور اس (ابنٌ) کی جمع سالم "بَنُوْنَ"

---

[1] اور ہر ایک فریق کے کچھ دلائل ہیں تفصیل چاہیں تو دیکھئے التبیان (للعکبری) ج ۱ ص ۵۷ اعراب القرآن (للنحاس) ج ۱ ص ۲۱۷ معجم الاعلال والابدال (للخراط) ص ۵۳۔ نیز البستان، اقرب الموارد اور مد القاموس (LANE) تحت مادہ "ب ن ی"۔

آنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ دراصل لفظ "بَنَوٌ" (یا بَنَیٌ) سے جمع سالم "بَنَوُونَ" (یا بَنَیُونَ) ہے جس میں خلاف قیاس "و" یا "ی" کا ضمہ (سے) ماقبل (متحرک) کو دے کر اس ("واو" یا "یاء") کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اصل "بَنْوٌ" یا "بَنْیٌ" بروزن "فَعْلٌ" ہو تو پھر اس سے جمع سالم "بنیون" یا "بنْوُون" قاعدہ قیاس کے مطابق "بَنُون" ہی بن جاتی ہے۔

● اس لفظ (ابن) کی جمع مکسر "ابناءٌ" بروزن "اَفْعَالٌ" ہے۔ (جس کی اصلی شکل "ابناوٌ یا ابنایٌ" تھی پھر الف ممدودہ کے بعد آنے والی "و" یا "ی" کو "ء" میں بدل کر لکھا اور بولا جاتا ہے)۔ بعض اہلِ علم اس جمع مکسر (ابناء) کو جمع مکسر کے اوزان اور ان کے بعض قواعد کی بنا پر اس لفظ کا مادہ "ب ن و" ہونے کی (اور اصل لفظ کے "بَنَوٌ" بروزن "فَعَلٌ" ہونے کی دلیل بتاتے ہیں۔[1]

● اس مادہ (ب ن ی) سے فعل مجرد زیادہ تر "بنَی ..... یَبْنِیْ بناءً و بُنْیَانًا" (باب ضرب سے) آتا ہے جس کے بنیادی معنی ہیں: "..... کو تعمیر کرنا، (عمارت وغیرہ) بنانا" یا (اس کی) بنیاد رکھنا" اور ان ہی معنی کے لیے فعل مجرد "بَنَا یبنُو بِنَاءً" (واوِیّ اللام اور باب نصر سے) بہت کم بلکہ شاذ ہی استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ایک (مزید) وجہ یا دلیل ہے اصل مادہ کے یائی اللام (ب ن ی) ہونے کی۔ اس سلسلے میں بعض کتب لغت میں اس مادہ سے فعل مجرد کے (مندرجہ بالا) معنی کی بنا پر لفظ "ابن" کے اس سے ماخوذ ہونے کی مناسبت یہ بیان کی گئی ہے کہ گویا "بیٹا" اپنے باپ کی (تعمیر کردہ) ایک عمارت ہے جس کا "بانی" (بصیغہ اسم الفاعل) یا "بَنّاءٌ" (بروزن "فَعّالٌ" بمعنی "راج") وہ (باپ) ہے[2] قرآن کریم میں اس

---

[1] دیکھئے سابقہ حوالہ جات یعنی التبیان وغیرہ [2] مثلاً المفردات (للراغب) اور البستان میں دیکھئے۔

فعل مجرد (بَنَى يَبْنِي) کے مختلف صیغے گیارہ جگہ وارد ہوئے ہیں۔ اور اس فعل کے مصادر اور بعض مشتق اسماء بھی گیارہ ہی جگہ آئے ہیں۔ البتہ اس مادہ سے ماخوذ کلمات بکثرت آئے ہیں ـــــ اور خود یہ لفظ (ابن) بصیغۂ واحد (مفرد یا مرکب صورت میں) ۴۱ جگہ، اس کی جمع سالم مختلف اعرابی حالتوں میں (مفرد یا مرکب) ۴۷ جگہ اور اس کی جمع مکسر " ابناء " مختلف صورتوں میں ۲۲ جگہ وارد ہوئی ہے۔

● زیرِ مطالعہ مرکب ندائی (یا بنی اسرائیل) کا تیسرا کلمہ " اسرائیل " (جس کے رسم عثمانی پر بعد میں بات ہوگی) دراصل عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کی اصل صورت غالباً " یسرائیل " ہے اور جس کے معنی غالباً " اللہ کا بندہ " ہیں۔ یہ لفظ حضرت یعقوب (بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام) کے لقب کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ عجمی اور علَم ہونے کے باعث یہ لفظ غیر منصرف ہے۔ عرب قبائل اس لفظ کو مختلف صورتوں میں بولتے تھے مثلاً " اسرائیل، إسرائیل، إسرال، اسرائِل اور اسرائین " وغیرہ۔ ان میں سے فصیح ترین قرآنی صورتِ لغات ہے۔ یہ لفظ (اسرائیل) قرآن کریم میں ۴۳ جگہ آیا ہے۔ جن میں سے پانچ مقامات پر تو اسی ترکیب ندائی (یا بنی اسرائیل) کی صورت میں آیا ہے۔

● اس طرح اس مرکب (یا بنی اسرائیل) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے " اے اسرائیل کے بیٹو "۔ اور اسرائیل سے مراد حضرت یعقوبؑ ہونے کے باعث بعض نے اس ترکیب کا ترجمہ " اے یعقوب کے بیٹو "، " اے یعقوب کی اولاد " اور " اے آلِ یعقوب " کیا ہے۔ جب کہ بعض مترجمین " اے اولادِ اسرائیل " اور بعض نے " اے بنی اسرائیل " ہی رہنے دیا ہے ـــــ خیال رہے کہ " بنی اسرائیل " یا " اسرائیلی " سے مراد عموماً " یہودی " مذہب کے پیروکار ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہندوؤں کی طرح بنیادی طور پر یہ بھی ایک نسلی مذہب ہے جو ایک خاص

نسل کے اندر محدود ہے۔

۲:۲۸:۱(۲) [اُذْکُرُوْا] کا مادہ "ذ ک ر" اور وزن "اُفْعُلُوْا" ہے۔ یہ لفظ دراصل "اُذکروا" ہے مگر سابقہ لفظ (اسرائیل) کے ساتھ ملا کر پڑھتے وقت ابتدائی ہمزۃ الوصل تلفظ سے گر جاتا ہے۔ اس مادہ (ذکر) سے فعل مجرد "ذکَرَ..... یذکُرُ ذِکْرًا" (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) "..... کو ذہن میں رکھنا'، ..... کو یاد رکھنا'، ..... کو یاد کرنا'، ..... کا خیال رکھنا" اور (۲) "..... کی بات کرنا'، ..... کا ذکر کرنا"۔ اور ان دو معنوں کی وجہ سے ہی "ذِکر" کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں "ذکرِ قلبی" (دل میں یاد کرنا' یاد رکھنا) اور "ذکرِ لسانی" (زبان سے کسی کا ذکر کرنا یا اس کا ذکر زبان پر لانا) ـــــ اور یہ دونوں قسم کا ذکر یا تو (۱) "نسیان" (بھول جانا) کے مقابلے پر ہوتا ہے یعنی "کسی بھولی ہوئی بات کا یاد آجانا"۔ اور یا (۲) کسی کی یاد کو مسلسل ذہن میں یا زبان پر محفوظ کرنا یعنی یاد رکھنا کے لئے۔ اردو میں عموماً لفظ "ذکر" زیادہ تر صرف "لسانی ذکر" کے لئے استعمال ہوتا ہے اس لئے اردو میں "ذکر کرنا" فعل بنایا گیا ہے "ذکر رکھنا" نہیں کہتے۔

● قرآن کریم میں یہ فعل (ذکَر یذکُر) مختلف مقامات پر مندرجہ بالا تمام معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ سیاق و سباق عبارت عموماً خود ہی معنی کے تعین میں مدد دیتا ہے۔ زیر مطالعہ کلمہ "اذکروا" اس مادہ کے فعل مجرد سے فعل امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس کا ترجمہ قریباً سب ہی مترجمین نے "یاد کرو" سے کیا ہے جس میں غور کرنے اور خیال رکھنے کا مفہوم موجود ہے۔

۲:۲۸:۱(۳) [نِعْمَتِیَ] یہ نِعْمَة + ی (ضمیر مجرور بمعنی "میری") کا مرکب ہے یعنی یہ "نِعْمَتِیْ" ہے جس میں آخری یائے ساکنہ (ی) کو آگے ملانے کے لئے فتحہ (ـَـ) دی گئی ہے۔ لفظ "نعمة" کا مادہ "ن ع م" اور وزن "فِعْلَةٌ" ہے۔ (یائے متکلم کی طرف مضاف ہوتے

کی وجہ سے " نعمۃ " کی آخری " تاء " کو کسرہ (ـِـ) دیا گیا ہے) اس مادہ (نعم) سے فعل مجرد کے باب اور معنی وغیرہ پر الفاتحہ: ۷ [۱:۶:۱(۲)] میں بات ہو چکی ہے۔

● " فِعْلَۃٌ " کا وزن عموماً " کسی (فعل کے معنی والی) حالت " میں ہونا کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے " نعمۃ " کے معنی "خوشحالی" (یا مالا مال ہونے یا تازہ و سرسبز ہونے کی حالت) کے ہیں جس سے انسان لطف اندوز ہوتا ہے ــــ اردو میں اگرچہ اس کا ترجمہ " فضل، کرم، عطاء، فیض، احسان، نوازش یا انعام " سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ تاہم خود لفظ "نعمۃ" (نعمت کی املاء کے ساتھ) اردو میں اپنے جملہ عربی معانی کے لئے مستعمل ہے۔

● یہ لفظ جب " اللہ " کی طرف مضاف ہو تو اس کے معنی " احسان، انعام یا فضل و کرم " ہی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر مترجمین نے یہاں اس کا ترجمہ " احسان " سے ہی کیا ہے۔ اگرچہ بعض نے " نعمت " اور " انعام " بھی استعمال کیا ہے بعض نے محاورہ اور مفہوم کی بناء پر (کہ نعمت صرف ایک نہیں تھی) صیغۂ جمع کی صورت میں یعنی " احسانات " یا " احسانوں " سے ترجمہ کیا ہے۔ لفظ " نِعمۃ " مفرد یا مرکب صورت میں قرآن کریم کے اندر کل ۷۴ دفعہ آیا ہے۔ اور سوائے دو مقامات کے (باقی) ہر جگہ اسم جلالت (اللہ) کی طرف یا اس کے لئے کسی ضمیر کی طرف مضاف ہو کر استعمال ہوا ہے۔

[الَّتِیْ] اسم موصول برائے واحد مؤنث ہے جس کا اردو ترجمہ " وہ جو کہ " یا " اس کو جو کہ " ہوگا۔ اسماء موصولہ کے مختلف صیغوں اور معنی پر الفاتحہ: ۷ [۱:۶:۱(۱)] میں بات ہو چکی ہے۔ ضرورت ہو تو دوبارہ دیکھ لیجئے۔

۲:۲۸:۱(۴) [اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ] جو " اَنعمتُ + علی (پر) + کم (تم) کا مرکب ہے۔ " اَنْعَمْتُ " مذکورہ بالا مادہ (ن ع م) سے باب افعال کا فعل ماضی صیغہ واحد متکلم ہے۔ اس باب سے فعل (اَنْعَم

مُنْعِمِ انعامًا = انعام دینا) کے معنی اور اس کے ساتھ "بِ" اور "علی" کے صلہ کے استعمال پر بھی الفاتحہ : ۷ [۱ : ۶ : ۱ (۲)] میں بات ہوئی تھی۔ اس جملہ (انعمت علیکم) میں صرف مُنْعَمٌ علیہ کا ذکر ہے مُنْعَمٌ بہ (نعمۃ) کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ یعنی یہاں "انعمت علیکم" میں "نعمۃ" کے لئے ایک ضمیر محذوف ہے گویا تقدیر عبارت ہے "انعمت بہا علیکم" (میری وہ نعمت جو میں نے تم پر کی / تم کو دی)۔ "نعمۃ" کا ترجمہ "احسان" یا "انعام" کرنے کی وجہ سے اکثر مترجمین نے "انعمت علیکم" کا ترجمہ "تم پر کیا" ہی کیا ہے۔ بعض نے "(نعمت جو) میں نے تم کو عطا کی" سے ترجمہ کیا ہے۔ اسی طرح "انعامات" اور "احسانوں" کے ساتھ فعل کا ترجمہ بصورت جمع یعنی "کئے" سے کرنا پڑا۔ یہ فرق صرف اردو میں فعل کے استعمال کے فرق کی وجہ سے ہے۔ مفہوم اور معنی تو یکساں ہے۔

۲ : ۲۸ : ۱ (۵) [وَ اَوْفُوْا] کی ابتدائی "وَ" تو عاطفہ بمعنی "اور" ہے اور کلمہ "اَوْفُوْا" کا مادہ "و ف ی" اور وزنِ اصلی "اَفْعِلُوْا" ہے۔ اس کی اصلی شکل "اَوْفِیُوْا" تھی۔ جس کی "یاء" پر ضمہ (ـُـ) ماقبل کے مکسور ہونے کی بناء پر عربوں کی زبان پر ثقیل تھا۔ اس لئے اس "یاء" کو ساقط کر دیتے ہیں۔ اور اس گرنے والی "یاء" سے پہلے والے حرف (جو مادہ کا عین کلمہ ہوتا ہے) پر ضمہ (ـُـ) یا فتحہ (ـَـ) ہو تو وہ برقرار رہتا ہے۔ لیکن اگر وہ کسرہ (ـِـ) ہو تو اسے ضمہ (ـُـ) میں بدل دیتے ہیں۔ اسی قاعدہ کے تحت یہاں "اَوْفِیُوْا" سے "اَوْفُوْا" بنا ہے۔ یہ قاعدہ ناقص واوی اور یائی کے فعل ماضی جمع مذکر غائب، فعل مضارع کا جمع مذکر غائب یا حاضر اور فعل امر جمع مذکر حاضر کے صیغوں میں اطلاق پذیر ہوتا ہے۔

● اس مادہ (و ف ی) سے فعل مجرد "وَفَی یَفِیْ (دراصل وَفَیَ یَوْفِیُ) وَفَاءً (باب ضرب سے) آتا ہے۔ یہ فعل بطور لازم بھی استعمال ہوتا ہے۔

اور اس کے بنیادی معنی "پورا ہونا" ہیں۔ پھر اس سے یہ "زیادہ ہونا، دراز ہونا" کے معنی دیتا ہے۔ اور اسی سے اسم الفاعل "وافٍ" اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں "یہ کافی وافی ہے"۔ اور یہی فعل بطور متعدی بھی استعمال ہوتا ہے یعنی "پورا کرنا، پورا دینا" کے معنی بھی دیتا ہے۔ اور اس صورت میں اس کا مفعول بنفسہ بھی آتا ہے مثلاً کہتے ہیں "وَفّٰی نَذْرَہٗ" (اس نے اپنی نذر پوری کی)۔ اور اگر اس کا مفعول "وَعْدٌ" (وعدہ) یا "عَھْدٌ" ہو تو پھر اس کے ساتھ باء (بِ) کا صلہ ضرور آتا ہے یعنی کہیں گے "وَفّٰی بِوَعْدِہٖ / بِعَھْدِہٖ" (اس نے اپنا وعدہ / عہد پورا کیا)۔ قرآن کریم میں اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد کا کوئی صیغہ تو کہیں استعمال نہیں ہوا۔ البتہ فعل مجرد سے بننے والا افعل التفضیل کا ایک صیغہ "اَوْفٰی" (بمعنی پورا / تمام) صرف ایک جگہ (النجم : ۴۱) وارد ہوا ہے۔ مزید فیہ کے ابواب افعال، تفعیل، تفعل اور استفعال سے (اس مادہ سے) مختلف افعال اور اسماء مشتقہ ۶۵ جگہ آئے ہیں جن کا بیان اپنی اپنی جگہ آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیر مطالعہ لفظ (اَوْفُوْا) اس مادہ (و ف ی) سے باب اِفعال کا فعل امر صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اس باب سے فعل "اَوْفٰی یُوْفِیْ اِیْفَاءً" (دراصل اَوْفَیَ یُوْفِیُ اِوْفَایًا) ہمیشہ بطور فعل متعدی استعمال ہوتا ہے اور اس کے بنیادی معنی (بھی) "پورا دینا یا ادا کرنا" ہیں۔ بعض دفعہ اس کے ساتھ مفعول بنفسہٖ آتا ہے مثلاً "اَوْفَی الْکَیْلَ" (اس نے پورا ناپ تول یا پیمانہ دیا)۔ فعل مجرد کی طرح "نذر پوری کرنا" کے لئے یہ فعل بھی صلہ کے بغیر اور (باء کے) صلہ کے ساتھ، دونوں طرح استعمال ہوتا ہے مثلاً کہیں گے "اَوْفٰی نَذْرَہٗ یا بِنَذْرِہٖ" (اس نے اپنی نذر پوری طرح ادا کی)۔ اور اگر اس فعل کا مفعول "عَھْدٌ یا وَعْدٌ" ہو تو (مجرد کی طرح) یہ فعل بھی "باء (بِ)"

کے صلہ کے ساتھ ہی آتا ہے۔ مثلاً کہیں گے "اوفیٰ بِوَعْدِہٖ" یا "بِعَھْدِہٖ" (اس نے اپنا وعدہ یا عہد پورا کر دیا) بعض دفعہ اس فعل کے ساتھ دوسرا مفعول بھی آتا ہے مثلاً "اَوفیٰ فلانًا حقَّہٗ" (اس نے فلاں کا حق پورا ادا کیا)۔ تاہم یہ دو مفعول والا استعمال قرآن کریم میں نہیں آیا"

● قرآن کریم میں اس فعل (اُوفی یُوفی) کے مختلف صیغے ۱۹ جگہ آئے ہیں۔ ان میں سے دس (۱۰) جگہ اس کا مفعول "عَھْدٌ" یا اس کا کوئی ہم معنی لفظ (مثلاً "عُقُود" وغیرہ) آیا ہے اور ان تمام مواقع پر یہ فعل "باء" کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ سات (۷) جگہ اس کا مفعول لفظ "کَیْلٌ" یا اس کا کوئی ہم معنی لفظ (مثلاً "میزان") آیا ہے اور ان تمام مقامات پر یہ فعل مفعول بنفسہ کے ساتھ آیا ہے ــــ دو جگہ اس کا مفعول لفظ "نذر" (یا بصورت جمع "نذور") آیا ہے اور یہ ایک جگہ (الدھر : ۷) "باء" کے صلہ کے ساتھ اور ایک جگہ (الحج : ۲۹) بغیر صلہ کے استعمال ہوا ہے۔ لفظ "اَوْفُوْا" کا ترجمہ قریباً تمام مترجمین نے "پورا کرو" سے ہی کیا ہے

[بِعَھْدِی] جو ب + عھد + ی کا مرکب ہے۔ اس میں "بِ" تو اس فعل (اَوفوا) کا صلہ ہے جو مفعول (عَھْدِی = میرا عہد) سے پہلے آیا ہے اور جس کے استعمال پر ابھی اوپر بات ہوئی ہے۔ بامحاورہ اردو میں اس "ب" کا کوئی ترجمہ نہیں ہوگا یا زیادہ سے زیادہ "کو" لگا سکتے ہیں یعنی "میرا عہد پورا کرو یا میرے عہد کو پورا کرو" ــــ لفظ عَھْد کے مادہ وزن، فعل مجرد وغیرہ پر البقرہ : ۲۷ [۲ : ۲۰ : ۱ (۲)] میں بات ہو چکی ہے۔ یہ لفظ (عَھْد) اردو میں قریباً اپنے تمام عربی معانی کے ساتھ مستعمل ہے۔ لہٰذا اس کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں اگرچہ بعض حضرات نے اس کی بجائے "اقرار" یا "وعدہ" بھی استعمال کیا ہے۔

یہاں "عَھْدِیْ" (میرا عہد) سے مراد وہ عہد ہے جو (تم نے)

میرے ساتھ کر رکھا ہے۔ اسی لئے بعض مترجمین نے اس (عَھْدِی) کا ترجمہ ہی " وہ اقرار/اس اقرار کو جو تم نے مجھ سے کیا تھا" کیا ہے۔ اکثر مترجمین نے "میرا عہد" ہی سے ترجمہ کیا ہے۔ البتہ بعض نے "میرا اقرار" اور بعض نے صرف "مجھ سے وعدہ" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔

۲ : ۲۸ : ۱ (۶) [اُوْفِ] کا مادہ (بھی) "و ف ی" اور وزن اصلی "اُفْعِلْ" ہے جس کی اصلی شکل "اُوْفِیْ" تھی۔ یہ جواب امر (اَوْفُوْا) ہونے کے باعث مجزوم ہوگیا اور فعل ناقص میں بحالت جزم لام کلمہ (آخری "و" یا "ی") ساقط کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اب یہ لفظ "اُوْفِ" رہ گیا ہے۔ اور یہ اس مادہ (وفی) کے باب افعال والے فعل (اَوْفٰی یُوْفِی) کے فعل مضارع (مجزوم) کا صیغہ واحد متکلم ہے۔ اس فعل کے مصدری معنی ابھی اوپر بیان ہوئے ہیں جواب امر ہونے کی بناء پر "اُوْفِ" کا ترجمہ "تو میں پورا کروں گا" ہونا چاہیئے تاہم بعض مترجمین نے "تو" کے بغیر صرف "پورا کروں گا" پر اکتفاء کیا ہے۔

[بِعَھْدِکُمْ] ابھی اوپر بیان ہونے والے مرکب "بِعَھْدِی" کی طرح یہ بھی بِ + عھد + کم کا مرکب ہے جس میں "بِ" تو فعل "اُوْفِ" کا صلہ ہے اور عھدکم" کا ترجمہ "تمہارا عہد" ہے اور اس سے مراد دراصل وہ عہد ہے جو (میں نے) تم سے کر رکھا ہے۔ اسی لئے بعض مترجمین نے "بعھدکم" کا ترجمہ "اس اقرار کو جو ہم نے تم سے کیا" کے ساتھ ہی کیا ہے۔ اگرچہ بیشتر حضرات نے صرف لفظی ترجمہ "تمہارا اقرار" "تمہارے عہد کو" اور "تم سے وعدہ" کی صورت میں کیا ہے۔

۲ : ۲۸ : ۱ (۷) [وَاِیَّایَ] یہ تین کلمات وَ (اور) + اِیَّا + ی (ضمیر متکلم) کا مجموعہ ہے "اِیَّا" کے مادہ، معنی اور استعمال کے بارے میں الفاتحہ: ۵ [۱ : ۴ : ۱ (۱)] میں بات ہو چکی ہے۔ یہاں "اِیَّا" کے ساتھ ضمیر منصوب (واحد

متکلم) "ی" آئی ہے اور اب یہ مکمل لفظ "اِیَّایَ" ضمیر منصوب منفصل ہے جو (قاعدے کے مطابق) ماقبل فعل ــ مفعول ہو کر آئی ہے۔ اس کا ترجمہ "صرف مجھ ہی کو" ہونا چاہیئے مگر اگلے فعل (فَارْهَبُوْنِ) کے مصدری اردو ترجمہ (ڈر رکھنا۔ ڈرنا) کی وجہ سے اردو محاورے کے مطابق "کو" کی بجائے "سے" کے ساتھ ترجمہ کیا گیا ہے۔ یعنی "صرف مجھ سے، مجھی سے، صرف مجھی سے، مجھ سے ہی، مجھ ہی سے اور میرا ہی" کے الفاظ اختیار کئے گئے ہیں۔ سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔

۲:۲۸:۱ (۸) [فَارْهَبُوْنِ] یہ دراصل ایک پورا جملہ ہے جو تین کلمات یعنی "فَ + اِرْهَبُوْا + نِ" کا مرکب ہے جس میں "فاء" تو عاطفہ بمعنیٰ "پس" ہے۔ آخری "نِ" وہ نونِ وقایہ ہے جو واحد متکلم منصوب ضمیر "ی" پر لگتا ہے۔ یعنی یہ دراصل "نِی" تھا مگر آخری ساکن "ی" تلفظ سے گرا دی گئی ہے (اور اس کی مثالیں قرآن کریم میں بکثرت ملیں گی)۔ اس ساقط "ی" کی علامت اب "نِ" کا کسرہ (ـِـ) ہے۔ اس طرح اس لفظ (نِ) کے معنی "مجھ کو" ہوں گے جسے اردو فعل سے ہم آہنگ کرنے کے لئے "مجھ سے" کے ساتھ ترجمہ کیا گیا ہے۔

● لفظ "اِرْهَبُوْا" (جس کا ابتدائی ھمزۃ الوصل "فَ" کے ساتھ ملانے کی وجہ سے تلفظ سے گر جاتا ہے اگرچہ کتابت میں موجود رہتا ہے۔ اور اس (ارھبوا) کا واو الجمع کے بعد لکھا جانے والا "ا" ضمیر مفعول کے آجانے کی وجہ سے کتابت سے حذف کر دیا جاتا ہے) کا مادہ "ر ھ ب" اور وزن "اِفْعَلُوْا" ہے۔ اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد "رَھِبَ ..... یرھب رَھْبًا" (باب فتح سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں: "..... سے ڈرنا"، "..... کا ڈر رکھنا"۔ یعنی یہ فعل متعدی

ہے۔ اس کا مفعول زیادہ تر تو بنفسہ آتا ہے اور کبھی اس کے ساتھ لام (ل) کا صلہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی " رَھِبَہ یا رَھِبَ لَہٗ (اس نے اس کا ڈر رکھا) دونوں طرح کہہ سکتے ہیں۔ اور قرآن کریم میں بھی یہ دونوں طرح استعمال ہوا ہے۔

● لفظ " اِرْھَبُوا " اس فعل مجرد (رَھِبَ یرھب) سے فعل امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس کا ترجمہ " تم ڈرو یا ڈرتے رہو یا ڈر رکھو " سے کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں اس مادہ (رھب) سے فعل مجرد کے تین صیغوں کے علاوہ مزید فیہ کے باب افعال اور استفعال سے بھی فعل کا ایک ایک صیغہ آیا ہے۔ اور اس مادہ سے مشتق اور ماخوذ مختلف کلمات (رَھَبٌ، رَھْبَۃ، رُھبان اور رُھبانیۃ) بھی متعدد جگہ وارد ہوئے ہیں۔ جن پر حسب موقع بات ہو گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیر مطالعہ آیت کے اس حصہ (وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ) میں ضمیر مفعول (منصوب) کے دو دفعہ (پہلے منفصل اور پھر متصل) آنے کی وجہ سے اس میں حصر اور تاکید کے معنی پیدا ہو گئے ہیں جس کو اردو ترجمہ میں " اور مجھ سے ہی ڈرو / صرف میرا ہی ڈر رکھو / مجھی سے ڈرتے رہو " کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے۔

[ وَآمِنُوْا ] کی " وَ " عاطفہ بمعنی " اور " ہے ——— اور " آمِنوا " کا مادہ " امن " اور وزن اصلی " اَفْعِلُوْا " ہے۔ اصلی شکل " أَأْمِنُوا " تھی جس میں " أَأْ " مہموز کے قاعدہ تخفیف کے تحت " آ " ہو گیا ہے (اس کے قرآنی ضبط پر آگے بات ہو گی)۔ یہ فعل اس مادہ (امن) سے باب افعال کا فعل امر صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ باب افعال کے اس فعل (آمَنَ یُؤمِنُ = ایمان لانا) کے معنی اور استعمال وغیرہ پر مفصل بات البقرہ: ۳ [۲:۲:۱(۱)]

میں گزر چکی ہے۔ اس صیغۂ فعل (آمِنوا) کا ترجمہ "تم ایمان لاؤ" ہے۔ بعض نے "مان لو" اور "مانو" سے بھی ترجمہ کیا ہے۔

[بِمَا اَنْزَلْتُ] یہ "بِ + ما + انزلتُ" کا مرکب ہے۔ جس میں باء (بِ) تو فعل "آمِنوا" کا صلہ ہے جس کا اردو ترجمہ اس فعل کے ساتھ "پر" سے کیا جاتا ہے — "مَا" موصولہ (بمعنی "جو کچھ کہ") ہے۔ اس قسم کے "بِمَا" پر [۲:۳:۱(۱)] میں بھی بات ہو چکی ہے۔ "بِمَا" کا اردو ترجمہ یہاں "اس پر/کو جو کچھ کہ" ہوگا۔ "اَنْزَلْتُ" کا مادہ "ن ز ل" اور وزن "اَفْعَلْتُ" ہے اور یہ اس مادہ سے بابِ افعال سے فعل ماضی کا صیغہ واحد متکلم ہے۔ اس فعل (اَنْزَلَ یُنْزِلُ = اتارنا) کی وضاحت البقرہ : ۴ [۲:۳:۱(۲)] میں گزر چکی ہے۔ یہاں عبارت میں "بِمَا انزلتُ" کے بعد "مَا" کی ضمیر عائد محذوف ہے۔ یعنی یہ دراصل "بما انزلتُہ" ہے جس کا لفظی ترجمہ "اس پر کہ میں نے اتارا اس کو/جس کو" ہوگا جس کی سلیس صورت "اس پر (ایمان لاؤ) جو میں نے اتارا" ہے۔

۲:۲۸:۱(۹) [مُصَدِّقًا] کا مادہ "ص د ق" اور وزن "مُفَعِّلٌ" ہے (مصدقًا کی نصب پر آگے "الاعراب" میں بات ہوگی)۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب، معنی اور استعمال پر البقرہ : ۲۳ [_____] میں بات ہو چکی ہے۔

● لفظ "مُصَدِّق" اس مادہ (صدق) سے بابِ تفعیل کا اسم الفاعل ہے اور اس باب سے فعل "صَدَّق ..... یُصَدِّق تصدیقًا" کے معنی ہوتے ہیں: "..... کی بات کو سچا کہنا، جاننا یا سمجھنا"۔ چونکہ اس کا مصدر "تصدیق" اپنے اصل عربی معنی کے ساتھ اردو میں مستعمل ہے۔ اس لئے اس کا ترجمہ "تصدیق کرنا" بھی ہو سکتا ہے۔

● یہ فعل (صدّق) مفعول بنفسہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے اور

(ب) کے صلہ کے ساتھ بھی ۔ یعنی صدّقہ اور صدّق بہ (اس نے اس کو سچا مانا) دونوں طرح کہہ سکتے ہیں [تصدیق تکذیب کی ضد ہے دونوں کے استعمال میں مقابلہ کے لئے فعل "کَذّبَ" کی وضاحت دیکھئے [۲ : ۷ : ۱ (۱۴)] میں ۔ البتہ کبھی اس فعل (صَدّق) کا مفعول محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے جو عبارت سے سمجھا جاتا ہے ۔ اور یہی فعل "علی" کے صلہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے اور اس صورت میں اس (صدّق علی......) کے معنی ہوتے ہیں: "......پر سچ پا لینا"......پر ثابت کر دکھانا" یعنی "......کے حق میں یا ......کے بارے میں (کسی بات کو) سچ پانا۔"

● قرآن کریم میں یہ فعل (صَدّق) مذکورہ بالا تینوں طریقوں سے استعمال ہوا ہے (۱) چار جگہ بغیر صلہ کے یعنی مفعول بنفسہ کے ساتھ (۲) چار ہی جگہ باء (ب) کے صلہ کے ساتھ (۳) صرف ایک (القیامۃ : ۳۱) مفعول کے ذکر کے بغیر اور (۴) ایک جگہ (سبأ : ۲۰) "علی" کے صلہ کے ساتھ آیا ہے ۔ ان سب کی وضاحت اپنے اپنے موقع پر آئے گی ۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ۔

آج کل جدید عربی میں "صدّق علی" کسی کام کی منظوری دینے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں "صدّق علی الامر (اس نے معاملے کی منظوری دی یا اس کی توثیق کی) ۔ ویسے اس میں بھی بنیادی معنی وہی "تصدیق کرنا" یا "سچا ماننا" والے ہی ہیں ۔

اس طرح کلمہ "مصدِّق" کے معنی بنتے ہیں "سچ ماننے والا، تصدیق کرنے والا، سچائی بیان کرنے والا" ۔ اور بعض مترجمین نے یہی ترجمہ کیا ہے ۔ تاہم اردو محاورے کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیشتر حضرات نے اس کا ترجمہ "تصدیق کرتا ہے، سچا کہتا ہے، سچ بتاتا ہے، سچا بتاتا ہے" سے کیا ہے یعنی اسم الفاعل کی بجائے فعل "یصدِّق" کی

طرح ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمہ کی ایک دوسری وجہ سے آگے حصہ "الاعراب" میں "مصدقًا" کی نصب کے سلسلے میں بات ہوگی۔

یہ لفظ (مصدِّق) قرآن کریم میں مختلف طریقوں سے ۱۶ جگہ آیا ہے۔

[لِمَا مَعَكُمْ] یہ لام (لِ = کے لئے یا کا) + ما (وہ جو کہ) + مَعَ (ساتھ) + كُمْ (تمہارا یا تمہارے) کا مرکب ہے۔ ان تمام کلمات کے معنی اور استعمال پر پہلے کئی جگہ بات ہو چکی ہے۔ مثلاً دیکھئے البقرہ: ۱۴ [۲ : ۱۱ : ۱ (۵)] اس طرح "لِمَا مَعَكُم" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "..... اس کا/کی جو تمہارے ساتھ/پاس ہے"۔ اور مراد ہے "خدا کی دی ہوئی کتاب اور شریعت میں سے جو کچھ (بچا کھچا) تمہارے پاس موجود ہے" (اس کی تصدیق کرتا ہے)۔ اسی لئے بعض مترجمین نے یہاں اس (لما معکم) کا تفسیری ترجمہ ہی کیا ہے یعنی "اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے یا جو تمہاری کتاب کو سچا کہتی ہے" کی صورت میں۔ اگرچہ بیشتر نے "جو تمہارے ساتھ/پاس ہے" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے اور ایک بزرگ نے اس کا ترجمہ "تمہارے پاس والے کو" (سچ بتاتا ہے) سے بھی کیا ہے۔ تمام تراجم کا مفہوم ایک ہی ہے۔

[وَلَا تَكُونُوا] یہ "وَ" (اور) + لَا (نہیں، مت) + "تکونوا" کا مرکب ہے اس (تکونوا) کا مادہ "ک و ن" اور وزن اصلی "تَفْعُلُوا" ہے۔ اس کی شکل اصلی "تَكْوُنُوا" تھی جس میں اجوف کے قواعد کے مطابق "وُ" کا ضمہ (ـُـ) ماقبل ساکن حرف صحیح (یا عین کلمہ ـ جو یہاں "ک" ہے) کو دے دیا جاتا ہے۔ اور اب ماقبل مضموم ہو جانے کے باعث واو ساکنہ برقرار رہتی ہے۔

● اس مادہ سے فعل مجرد (کان یکون = ہونا) کے معنی، باب اور استعمالات پر البقرہ: ۱۰ [۲ : ۸ : ۱ (۱۰)] میں بات ہو چکی ہے۔

زیرِ مطالعہ کلمہ " لا تکونوا " اس فعل مجرد سے فعل نہی کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے ۔ اس کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے " تم نہ ہو " ۔ جس کے لئے مختلف مترجمین نے " مت ہو، مت بنو ، نہ بنو اور مت ہو جاؤ " کے الفاظ اختیار کئے ہیں ۔ مفہوم یکساں ہے ۔

۲ : ۲۸ : ۱ (۱۰) [ أَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ ] اس ترکیب کے دو حصے ہیں ۔ " اوّل " اور " کافر بہ " ہم پہلے ان دونوں حصوں پر الگ الگ بات کرتے ہیں ۔ پھر اس ترکیب کے مجموعی ترجمہ پر بات ہوگی ۔

● " أَوَّلَ " (جو یہاں منصوب ہے اور اس نصب کی وجہ آگے " الاعراب " میں بیان ہوگی) کے مادہ اور وزن کے بارے میں اصحابِ لغت کے مختلف اقوال ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

(۱) ایک قول یہ ہے کہ اس کا مادہ " أول " اور وزن " أَفْعَلُ " ہے ۔ اس طرح یہ دراصل " أَأْوَلُ " (افعل التفضیل) تھا جس میں خلافِ قیاس دوسرے ہمزہ (ساکنہ) کو واو میں بدل کر مدغم کر دیا گیا ہے ۔ اب اس کا وزن " أَعَلُ " رہ گیا ہے ۔ (از روئے قیاس اسے " آوَلُ " ہونا چاہئے تھا) یا پھر اس کا وزن ہی " فَعَّلُ " ہے جو بظاہر " افعلُ " کی طرح آتا ہے ۔ البتہ اس سے مؤنث " أُوْلٰى " ٹھیک اپنے اصلی وزن " فُعْلٰى " پر ہی آتا ہے ۔ اس مادہ (أول) سے فعل مجرد " آلَ يَئُوْلُ (دراصل أَوَلَ يَأْوُلُ) أَوْلاً " (باب نصر سے) " لوٹ کر آنا یا ہو جانا " کے معنی دیتا ہے ۔ اور " أَوِلَ يَأْوَلُ أَوْلاً (باب سمع سے) " آگے نکل جانا یا پہلے گزر جانا " کے معنی میں آتا ہے ۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی طرح کا فعل مجرد کہیں استعمال نہیں ہوا ۔ البتہ باب تفعیل کا صرف مصدر (تَأْوِيل) قرآن کریم میں ۱۷ جگہ وارد ہوا ہے ۔ اس کے معنی پر آل عمران: ۷ میں بات ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ ۔ المنجد اور مفرداتِ راغب میں یہ لفظ (اوّل)

اسی مادہ کے تحت بیان ہوا ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا مادہ "و أ ل" اور وزن "اَفْعَلُ" ہے۔ گویا اس کی اصل شکل "أَوْأَلُ" تھی۔ پھر خلافِ قیاس دوسرے ہمزہ (عین کلمہ) کو "واو" میں بدل کر واو (فاء کلمہ) میں مدغم کر دیا گیا۔ یعنی "أَوْأَلُ ← أَوْوَلُ ← أَوَّلُ" اور اب یہ وزن "اَفَلُّ" رہ گیا ہے۔ (از روئے قیاس اسے "اَوَالُ" ہونا چاہیئے تھا) اور اس سے مؤنث "اُوْلیٰ" بھی دراصل "وُوْلیٰ" تھی۔ پھر ہمزہ اور واو کی جگہ (باہم) بدل کر تقلیب کے بعد "اُوْلیٰ" بنا (پنجابی کے "چاقو" اور "قاچو" کی طرح) ——— اس مادہ (د أ ل) سے فعل مجرد "وَأَلَ یَئِلُ (دراصل یَوْءِلُ) وَأْلًا" (باب ضرب سے) "نجات چاہنا، پناہ ڈھونڈنا" کے معنی دیتا ہے۔ اس مادہ سے بھی کوئی فعل (مجرد یا مزید فیہ) قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ البتہ اس فعل سے اسم ظرف کا ایک صیغہ (مَوْئِلٌ) صرف ایک جگہ (الکھف: ۵۹) آیا ہے۔ اکثر کتب لغت (مثلاً القاموس المحیط، البستان اور المعجم الوسیط) میں لفظ "اَوَّل" اسی مادہ "و أ ل" کے تحت بیان ہوا ہے۔

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ اس (اوّل) کا مادہ "و و ل" اور وزن "اَفْعَلُ" ہی تھا جواب "اَفَلُّ" یا "اَعَلُّ" رہ گیا ہے۔ یا یہ لفظ دراصل "وَوَّلُ" بروزن "فَعَّلُ" تھا مگر ابتدائی "واو" الف (ہمزہ) میں بدل دی گئی جیسے "وُقِّتَتْ" سے "اُقِّتَتْ" یا "وَحَدٌ" سے "اَحَدٌ" بنا لیا جاتا ہے اس مادہ سے کوئی فعل استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے صرف یہی ایک لفظ (اول) مشتق ہے۔ اس صورت میں مؤنث بھی دراصل "وُوْلیٰ" تھی۔ پھر مندرجہ بالا عمل کی طرح ابتدائی واو ہمزہ میں بدل دی گئی ہے۔ اس لفظ (اَوَّل) کی جمع "اَوَائِل" کی اصل بھی اسی مادہ سے

دراصل " آوَاوِلَ " تھی جس میں دوسری واؤ ھمزہ میں بدل جاتی ہے۔[۱]

● بہرحال لفظ " اوّل " کی جو بھی اصل مانیں یہ لفظ اپنے وزن اور معنی کے لحاظ سے زیادہ تر افعل التفضیل ہی بنتا ہے ۔ یعنی اس کے معنی ہیں " سب سے پہلا "، جس کے لئے صرف " پہلا " کہہ دینا ہی کافی ہے ۔ افعل التفضیل صفت کا صیغہ ہے اور یہ لفظ (اول) جب صفت کے معنی میں استعمال ہو تو غیر منصرف ہی رہتا ہے تاہم یہ لفظ (اوّل) کبھی صفت کی بجائے کسی دوسرے اسم کے معنی (مثلاً حال) کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اس وقت یہ مُعْرَب استعمال ہوتا ہے مثلاً " آوَّلاً " میں ۔ تاہم قرآن میں اس کا یہ (معرب والا) استعمال کہیں نہیں ہوا[۲]

● " کافِرٍ بہ " جو زیر مطالعہ ترکیب " اول کافر بہ " کا دوسرا حصہ ہے ۔ اس میں لفظ " کافر " فعل کفَر یکفُر (انکار کرنا) سے اسم الفاعل ہے ۔ اس فعل کے باب معنی اور استعمال کے لیے دیکھئے البقرہ: ۶ [ ۲:۵ : ۱ (۱) ]

" بہ " کی (ب) وہ ہے جو اس فعل (کفر) کے صلہ کے طور پر آتی ہے اور آخری (ہ) ضمیر مجرور بمعنی " اس " ہے ۔ اس طرح " کافر بہ " کا ترجمہ ہوا : " اس کا کافر "، " اس کا انکار کرنے والا "۔

● اور اس ترکیب [ اَوَّلَ کافِرٍ بہ ] میں (۱) لفظ " کافر " یا تو بمعنیٔ جمع استعمال ہوا ہے جو " اوّل " کا مضاف الیہ واقع ہوا ہے کیونکہ " اَفْعَلُ " عموماً جمع معرفہ کی طرف مضاف ہوتا ہے ۔ گویا یہاں " اول الکافرین "

---

۱ " اوّل " کی اصل کی تفصیلی بحث کے لیے دیکھئے القاموس المحیط مادہ " ودل " ، البستان مادہ وأل، التبیان (للعکبری) ج ۱ ص ۵۷-۵۸ ، البیان (لابن الانباری) ج ۱ ص ۷۸ یا کوئی بھی مبسوط ڈکشنری ۔

۲ " اوّل " کے مختلف استعمالات کے لیے دیکھئے " الاعراب الکامل " (عبدالقادر) ص ۷۸-۷۹۔

(کافروں کا نمبر ایک یا پہلا کافر) مراد ہے۔ (۲) افعل التفضیل کا مضاف الیہ (یعنی کافرٍ) یہاں ایک محذوف موصوف کی صفت ہے یعنی تقدیر (دراصل) عبارت "اوّلَ فریقٍ کافرٍ" ہے۔ اور (۳) یہ بھی قاعدہ ہے کہ اگر افعل التفضیل کا مضاف الیہ نکرہ ہو تو وہ ہمیشہ واحد ہی رہتا ہے مثلاً کہتے ہیں "انت افضلُ رجلٍ" (تو بہترین آدمی ہے)۔ اسی طرح "انتما افضلُ رجلٍ" اور "انتم افضلُ رجلٍ"۔ اور "احسنُ رجلٍ" کا مطلب "کسی آدمی کا بہترین پہلو یا حصہ یا نمونہ یا شخصیت" بھی ہوتا ہے اس طرح "اوّل کافرٍ" کا مطلب "کفر کا پہلا نمونہ یا حصہ" بھی ہو سکتا ہے۔

● مندرجہ بالا امور کو سامنے رکھتے ہوئے مترجمین نے اس ترکیب (اول کافرٍ بہ) کا ترجمہ "اس کے پہلے کافر، پہلے منکر، سب میں پہلے انکار کرنے والے، سب سے پہلے منکر" اور (اس کے ساتھ) "اولین کفر کرنے والے" کی صورت میں گویا سب نے یہاں "کافر" کو ترکیب کے تقاضے کی بنا پر جمع کے معنی میں لیا ہے۔

[ وَلَا تَشْتَرُوا ] کا مادہ "ش ر ی" اور (پورے صیغے کا) وزنِ اصلی "ولا تفتعِلوا" ہے۔ یہ فعل دراصل "لا تشترِیوا" تھا۔ یعنی یہ اس مادہ سے بابِ افتعال کا فعل نہی صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ پھر واو الجمع سے ماقبل یاء کو (جو لام کلمہ ہے) گرا کر اس سے ماقبل (عین کلمہ) کا کسرہ (ـِـ) ضمہ (ـُـ) میں بدل دیا جاتا ہے (یہ قاعدہ آپ اس سے پہلے کئی کلمات (مثلاً "خَلَوْا" ۲:۱۱:۱(۲)، "لَقُوْا" ۲:۱۱:۱(۱)، "اِشْتَرَوْا" ۲:۱۲:۱(۱) اور ابھی اوپر "اَوْفُوا" ۲:۲۸:۱(۵) میں دیکھ چکے ہیں۔ فعل ناقص کے واو الجمع والے صیغوں میں اس قسم کی تبدیلی کی بے شمار مثالیں آئندہ بھی ہمارے سامنے آئیں گی۔ اس کو ہم آئندہ صرف "ناقص میں واو الجمع والا قاعدہ" کہہ کر ہی بیان کیا کریں گے۔

● اس مادہ (شری) سے فعل مجرد کے باب اور معنی کے علاوہ اس سے باب افتعال کے معنی پر بھی البقرہ : ۱۶ [ ۲ : ۱۲ : ۱ (۱) ] میں بات ہو چکی ہے۔ بعض کتب لغت (مثلاً " البستان ") میں فعل مجرد " شرٰی یشری " اور باب افتعال سے فعل " اشترٰی یشتری " کو لغت اضداد میں شمار کیا گیا ہے یعنی دونوں " خریدنا " کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور " بیچنا " کے لئے بھی۔ اس طرح یہاں " وَلَا تَشْتَرُوا " کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے " اور مت خریدو "۔ اور اسی کے لئے بعض مترجمین نے " مت مول لو " اختیار کیا ہے۔ لیکن آگے " خریدی جانے والی شے " ثمن قلیل " (تھوڑی قیمت) بیان ہوئی ہے اس لئے بعض نے اس کا ترجمہ " مت فروخت کرو " کیا ہے۔ اور قیمت کے ذکر کی مناسبت سے ہی بیشتر مترجمین نے اس (لا تشتروا) کا ترجمہ " نہ لو " اور " مت حاصل کرو " کی صورت میں کیا ہے۔

[ بِاٰیٰاتِیْ ] یہ " بِ " (کے عوض) + آیات (احکام۔ فرامین) + " ی " (ضمیر متکلم مجرور بمعنی " میری ") کا مرکب ہے۔ ان تمام کلمات پر پہلے بات ہو چکی ہے مثلاً باء (بِ) کے استعمالات پر استعاذہ کی بحث میں اور کلمہ " آیات " کے مادہ اور معنی وغیرہ کے بارے میں البقرہ:۳۹ [ ۲ : ۲۷ : ۱ (۷) ] میں وضاحت کی جا چکی ہے۔

● فعل " اشترٰی " کے بعد " بِ " کا صلہ اس چیز پر آتا ہے جو عوض میں (بطور قیمت) دی جا رہی ہو اور جو چیز خریدی جائے (لے لی جائے) اس کا ذکر اس فعل کے ساتھ مفعول بنفسہ کے طور پر ہوتا ہے اس لئے یہاں (فعل لا تشتروا کے بعد) " بِآیاتی " کا مطلب " میری آیات کے بدلے میں " یعنی " میری آیات کو قیمت بنا کر " ہے اور یوں اس کا ترجمہ " میری آیات (احکام) کے عوض " کیا گیا ہے۔

۲ : ۲۸ : ۱ (۱۱) [ ثَمَنًا ] کا مادہ " ث م ن " اور وزن " فَعَلٌ " ہے۔ (ثمناً کی نصب پر آگے " الاعراب " میں بات ہو گی) ۔اس مادہ سے فعل مجرد باب نصر سے بھی آتا ہے اور باب ضرب سے بھی ۔ " ثمَن ..... .... یثمُن ثمناً (نصر) کے معنی ہیں : " ..... سے مال کا آٹھواں حصہ وصول کرنا " اور ثمَن یثمِن ثمَنًا (ضرب) کے معنی ہیں " ..... کے ساتھ آٹھواں ہونا (یعنی جو پہلے سات تھے) اس طرح (مثلاً " ثَمَنْتُهُمْ " کے دو معنی ہو سکتے ہیں (۱) میں نے ان سے ⅛ حصہ وصول کیا ۔ اور (۲) میں ان (سات) کے ساتھ آٹھواں شامل ہو گیا ۔ (اس لئے کہ فعل ماضی میں " باب " واضح نہیں ہے) ۔عربی زبان میں اس مادہ سے مزید فیہ کے بعض ابواب بھی مختلف معانی کے لئے استعمال ہوتے ہیں تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کا کوئی فعل کہیں استعمال نہیں ہوا ۔البتہ اس مادہ سے ماخوذ اور مشتق بعض کلمات (مثلاً ثامن ، ثمانیة ، ثُمُنٌ اور ثَمَنٌ وغیرہ) مختلف صورتوں میں (مفرد مرکب معرفہ نکرہ) کل ۱۹ جگہ وارد ہوئے ہیں جن پر حسب موقع بات ہو گی ۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ۔

● لفظ " ثَمَنٌ " کے معنی کسی چیز کی قیمت (مول ، دام) ہیں جو کوئی خریدار فروخت کنندہ کو ادا کرتا ہے ۔عموماً اس سے مراد نقدی یا سکے وغیرہ ہوتے ہیں ۔تاہم کبھی یہ لفظ مطلقاً (کسی چیز کے) بدلہ یا عوض میں لی (یا دی) جانیوالی چیز کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔کیونکہ خرید و فروخت میں دراصل تو ہر ایک فریق ایک چیز " بیچ " اور دوسری " خرید " رہا ہوتا ہے ۔ابھی اوپر بیان ہوا ہے کہ فعل " اشتری " کے ساتھ " لی " جانے والی شے براہ راست بطور مفعول بنفسہ مذکور ہوتی ہے ۔اور جو شے (بطور قیمت) عوض میں " دی " جا رہی ہو اس پر باء (بِ) کا صلہ آتا ہے ۔

● زیر مطالعہ آیت میں " آیات " کی " قیمت " خریدنے (لینے ۔ حاصل کرنے)

کی بات ہو رہی ہے جس کے عوض (بدلے میں) "آیات" (احکام الٰہی) "دی" جا رہی ہوں یعنی کسی مالی منفعت کے عوض ان کو نظر انداز کرنا مراد ہے۔ اور چونکہ کسی چیز کی قیمت "خریدنا" کم ازکم اردو محاورے کے لیے غیر مانوس ہے اس لیے اکثر مترجمین نے "ثمناً" (قیمت) کے ساتھ فعل "اشتراء" کا (مصدری) ترجمہ "خریدنا" کی بجائے "لینا" سے کیا ہے جیسا کہ بعض نے اردو محاورے کے مطابق اس کا ترجمہ "بیچنا" اور "فروخت کرنا" سے کر لیا ہے۔ [اسی لیے لاتشتروا کا ترجمہ "مت مول لو، نہ لو، مت لو، حاصل نہ کرو اور فروخت مت کرو" کی صورت میں کیا گیا ہے جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا ہے۔

**۲:۲۸:۱:۱ (۲) [قَلِيلًا]** یہ "قلیل" کی نصبی صورت ہے (جس کی وجہ نصب پر آگے "الاعراب" میں بات ہوگی) اس کلمہ کا مادہ "ق ل ل" اور وزن "فَعِيْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "قَلَّ يَقِلُّ قِلَّةً" (باب ضرب سے) آتا ہے اور اس کے معنی "کم ہونا، تھوڑا ہونا" ہیں (یعنی کثرۃ = زیادہ ہونا کی ضد) اور اس سے یہ "کمیاب ہونا" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی یہ فعل لازم ہے۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے ماضی کا صرف ایک صیغہ ایک جگہ (النساء: ۷) آیا ہے۔ مزید فیہ کے باب تفعیل اور افعال سے بھی صرف ایک ایک صیغہ (علی الترتیب الانفال: ۵ اور الاعراف: ۵۷ میں) آیا ہے۔

● یہ لفظ (قلیل) اس فعل مجرد (قَلَّ يَقِلُّ) سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں "بہت تھوڑا، تھوڑا سا یا بہت کم" — اور خود لفظ "قلیل" بھی اردو میں مستعمل ہے۔ کبھی انگریزی کے لفظ FEW کی طرح یہ لفظ "بہت کم" کی بجائے "نہ ہونے" یعنی مطلق نفی کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً "رجل قلیل الخیر" کے معنی ہیں "جس میں بھلائی

نہ ہونے کے برابر ہو" اور " قلیل من الناس یقولون ذلک" کا مطلب ہے کہ " لوگوں میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا" ۔ قرآن کریم میں بعض جگہ " قلیل" کے یہی معنی (یعنی مطلقاً نفی والے) لینے کی گنجائش ہے ــ ویسے قرآن کریم میں یہ لفظ (قلیل) بکثرت (ستر سے زیادہ جگہ آیا ہے) ان میں سے صرف بارہ جگہ یہ بصورت " قلیل" (مرفوع یا مجرور) اور باقی تمام مقامات پر منصوب (قلیلاً) استعمال ہوا ہے۔

● یہ (قلیل) اسم صفت ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اکثر جگہ اس کا موصوف محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے جو سیاقِ عبارت سے سمجھا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم میں " قلیل" کی جمع سالم " قلیلون" ایک جگہ (الشعراء : ۵۵) اس کا صیغہ تانیث " قلیلۃ" بھی ایک جگہ (البقرہ : ۲۴۹) اور افعل التفضیل کا صیغہ " اقلّ" دو جگہ (الکھف : ۴۰ اور الجنّ : ۲۴) آیا ہے۔ خود یہ زیر مطالعہ ترکیب " ثمنا قلیلاً " چھ (۶) جگہ وارد ہوئی ہے اور اس (ترکیب) کا اردو ترجمہ " تھوڑا مول، حقیر معاوضہ، تھوڑی سی قیمت، اور تھوڑے دام" کی صورت میں کیا گیا ہے۔

[ وَاِیَّایَ ] یہ ابھی اوپر (آیت نمبر ۴۰ کے آخر پر) [۲ : ۲۸ : ۱ (۷)] میں گزر چکا ہے یعنی " مجھ ہی سے، صرف مجھی سے"۔

[ فَاتَّقُوْنِ ] یہ بھی فَ + اِتَّقُوْا + نِ کا مرکب ہے جس میں ابتدائی " فاء" عاطفہ بمعنی " پس" ہے اور آخری " نِ" دراصل " نِیْ" (یعنی نون وقایہ مع یاء متکلم (بمعنی مجھ سے) تھا جس میں " ی" گرادی گئی ہے مگر اس کی علامت نون کا کسرہ (ــِ) ہے ــ درمیانی فعل " اِتَّقُوْا" (جس کا ابتدائی ھمزۃ الوصل فاء سے ملنے کی بناء پر تلفظ سے اور واو الجمع کے بعد والا الف زائدہ آگے ضمیر مفعول (منصوب) آنے کی بناء پر کتابت سے ساقط ہوگیا ہے) کا مادہ " و ق ی" اور وزن اصلی " اِفتَعِلُوا" ہے ۔ اصلی شکل

" اِوْتَقِيُوا " تھی۔ جس کی ابتدائی " واو " (مثال واوی کے باب افتعال
کے قاعدہ کے تحت) " ت " میں بدل کر مدغم ہوگئی ہے اور " یاء " فعل
" ناقص کے واو الجمع والے قاعدے " کے مطابق گرا کر عین کلمہ (ق) کو
کسرہ کی بجائے ضمہ ( ـُ ) دیا گیا ہے۔

● یہ لفظ " اِتَّقُوا " فعل " اتّقى يتّقي " سے صیغہ امر مخاطب ہے۔ اس
فعل (اتّقى يتّقي اتّقاء) کے معنی اور استعمال پر البقرہ: ۲ [۱:۱:۲ (۷)] میں
مفصل بات ہو چکی ہے۔ اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ " اِتّقاء " کے بنیادی
معنی " بچنا " ہیں۔ تاہم اس "بچنے" کی وجہ کوئی "ڈر" ہی ہو سکتا ہے اس لئے
اس کا ترجمہ "ڈرنا" سے بھی کر لیا جاتا ہے۔ اسی لئے بیشتر مترجمین نے یہاں
" فَاتَّقُونِ " کا ترجمہ "پس مجھ سے پورے طور پر ڈرو، ڈرتے رہو، ڈرو،
ڈر رکھو، خوف رکھو" کی صورت میں کیا ہے۔ اگرچہ بعض نے لفظی ترجمہ "مجھ سے
بچتے رہو" ہی رہنے دیا ہے۔

● اور زیر مطالعہ آیت کے آخری حصہ (وایایَ فاتقون) میں بھی [سابقہ
آیت کے آخری حصہ " وایایَ فارھبون " کی طرح] ضمیر منصوب کے دو
دفعہ (پہلے منفصل پھر متصل) آجانے کی وجہ سے حصر اور تاکید کے معنی پیدا
ہو گئے ہیں۔ اس لیے ترجمہ " مجھ ہی سے، میرا ہی، صرف مجھ سے " کے
ساتھ کیا گیا ہے۔

جن حضرات کے لیے

**محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دورۂ ترجمہ قرآن**

کے آڈیو کیسٹ کا مکمل سیٹ یکمشت خریدنا ممکن نہ ہو اور وہ اقساط
کی صورت میں یہ سیٹ حاصل کرنا چاہیں وہ درج ذیل پتے پر خط لکھ کر
تفصیلات طلب کریں

محمد عمر خان (قصر عبداللہ) ۱۰۸/۸۴۸ کہکشاں اسٹریٹ ۵ نیو گلگشت کالونی، ملتان

# تعارفِ کتب

○ مکاتیب سر محمد اقبال بنام مولانا سید سلیمان ندوی
مرتب: سید شفقت رضوی
قیمت: 60 روپے' ملنے کا پتہ: مکتبہ شاہد 9 علی گڑھ کالونی کراچی 75800

علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی ماضی قریب کی دو اہم علمی شخصیتیں تھیں' دونوں کی عمروں میں زیادہ تفاوت نہ تھا' دونوں ملی درد سے سرشار تھیں اور ملت کی ترقی و عروج کی خواہاں ---- علامہ اقبال مرحوم نے بقول خود شاعر نہ ہو کر بھی مفید خیالات کو ظاہر کرنے کی غرض سے شاعری کا سہارا لیا (ص 23) تو سید سلیمان ندوی نے انتہائی مفید لٹریچر فراہم کیا اور نثری اعتبار سے اردو میں بہت کچھ لکھ ڈالا۔ ہر دو حضرات کی مراسلت کا سلسلہ 1914ء سے قائم ہوا (ص 17) اور اقبال کی زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ابتدا کس طرف سے ہوئی لیکن قرائن یہ بتلاتے ہیں کہ ابتدا کرنے والے مرحوم اقبال تھے' اقبال نے پروفیسر رشید احمد صدیقی سے دینی مسائل میں رہنمائی کی غرض سے کسی عالم کی نشاندہی کرنے کا کہا تو صدیقی صاحب نے سید صاحب کا نام لیا جسے علامہ نے پسند کیا (ص 18) اور غالباً اس کے بعد ہی مراسلت شروع ہو گئی۔ زیر نظر مجموعہ میں ستر خطوط ہیں' لیکن بہرحال یہ اصل سے بہت کم ہیں' سید صاحب نے کوشش کرکے اپنی حد تک خطوط کو محفوظ رکھا تو ان کے جانشین شاہ معین الدین ندوی نے انہیں "معارف" اعظم گڑھ میں شائع کردیا۔ علامہ اقبال سید صاحب کا حد درجہ احترام کرتے جس کا اندازہ آپ ان خطوط کو پڑھ کر خود کرسکیں گے۔ فاضل مرتب نے ص 21 پر ان خطوط کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خطوط میں سید صاحب کی فضیلت علمی کا اعتراف ہے۔ اپنی شاعری کے متعلق اظہار خیال ہے۔ مذہبی امور' تاریخ اسلام' اسلامی فلسفہ' تصوف اور سائنس کے متعلق استفسارات ہیں جبکہ بعض کتب کے متعلق بھی سوالات ہیں۔ یہ خطوط جب معارف میں قسط وار شائع ہوئے تو سید صاحب کے اپنے قلم سے یا شاہ معین الدین کے قلم سے بعض بعض مقامات پر انتہائی مختصر لیکن مفید حواشی دیئے گئے جبکہ مرتب نے بھی بعض مقامات پر حواشی دیئے ہیں۔ ان خطوط میں جتنے اہم سوالات ہیں ان کے جوابات سید صاحب نے یقیناً دیئے جیسا کہ علامہ کے بعد والے خطوط سے معلوم ہوتا ہے' علامہ ایسے

معاملات میں جن حضرات سے رابطہ کرتے ان میں مولانا سید انور شاہ' سید سلیمان ندوی اور پیر مہر علی شاہ کے نام نمایاں ہیں جبکہ مقامی طور پر مولانا احمد علی لاہوری اور پروفیسر اصغر علی رومی کے نام لئے جاتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ علامہ کے خطوط کے جواب میں ان بزرگوں نے جو لکھا اس کا کوئی اتہ پتہ نہیں علامہ کے عقیدت مندوں نے بہت کچھ ڈھونڈ نکالا اور بہت کچھ چھاپ دیا لیکن ان علمی اکابر کے خطوط غائب ہیں' انہیں زمین نے نگل لیا یا آسمان نے اچک لیا کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اگر وہ تمام سرمایہ محفوظ و موجود ہوتا تو آج علمی دنیا اس سے بڑا فائدہ اٹھاتی اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کو اندازہ ہوجاتا کہ بوریہ نشیں حضرات کا سرمایہ علم و عرفاں کس حد تک وقیع ہے۔ بہرحال جوابی سرمایہ نہ ہونے کے باوجود ان مکاتیب کی ایک اہمیت ہے اور معارف کی اشاعت کے دوران ان پر جو مختصر حواشی لکھے گئے وہ بھی کم قیمتی نہیں فاضل مرتب نے اپنے وقیع مقدمہ میں ہر دو شخصیات کے تعارف کے ساتھ ان کے باہمی مراسم اور خطوط کی قدر و قیمت کو خوب خوب اجاگر کیا ہے جبکہ خطوط میں جن بزرگوں اور معاصرین کا ذکر آیا "رجال مکاتیب اقبال" کے عنوان سے ان کا تعارف بھی کرادیا ہے جس سے اس مجموعہ کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ اقبال و سید سلیمان پر تحقیقی کام کرنے والے اہل علم کے ساتھ ساتھ عام علمی برادری کے لئے بھی یہ سرمایہ بڑا قیمتی ہے جس کی قیمت بھی بڑی مناسب ہے۔

☆☆☆

علامہ اقبال اور مولانا محمد علی' تالیف: ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری
ملنے کا پتہ: مکتبہ شاہد و علی گڑھ کالونی کراچی 75800

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری معاصر اور ماضی قریب کی تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے صاحب علم ہیں' انہوں نے مختلف دینی' علمی اور ملی شخصیات اور اداروں پر تن تنہا اتنا کام کیا کہ ایک ادارہ اور اکیڈمی مل کر بھی شاید اتنا کام نہ کرسکے۔ زیر تبصرہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن اس وقت سامنے ہے اس میں مولانا محمد علی کے پانچ طویل مضامین علامہ اقبال کے متعلق ہیں جو مولانا کے اخبار میں شائع ہوئے' پہلا مضمون "میرا استاد اقبال" ہے' دوسرا "طبیب حاذق سر اقبال کا نیا نسخہ" تیسرا "شاعر وطن" چوتھا "شاعر اسلام" اور پانچواں "شمع و شاعر کے مصنف سے ایک سوال" جبکہ مجموعہ میں علامہ کی دو تقریریں ہیں جو پنجاب کونسل کے ممبر کی حیثیت سے انہوں نے کیں ایک کا تعلق فرقہ وارانہ فسادات سے ہے تو دوسری ملازمتوں کے لئے مقابلے کے امتحان پر۔ 18 جولائی 1927ء اور 19 جولائی 1927ء کی ان تقریروں کے حوالہ سے ہی مولانا نے زیادہ لکھا۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپا تھا تو یہ تقریریں شامل نہ تھیں اس لئے مولانا محمد علی کے مضامین پر آسانی سے رائے قائم کرنا مشکل تھا اب جبکہ تقریریں ساتھ شامل ہیں تو

ایک قاری زیادہ بہتر رائے قائم کر سکتا ہے اور وہ جب رائے قائم کرے گا تو مولانا محمد علی کو ہزار بار مخلص مان کر بھی جذباتی، شدت پسند اور بہت کچھ ماننے پر مجبور ہوگا جن کے زبان و قلم سے سیدنا معاویہ سے لیکر آخری خلیفہ ترکی تک کوئی نہ بچ سکا اور اپنے معاصرین تو کسی شمار قطار میں نہ تھے، کتاب کے فاضل مرتب نے اپنے ایک تحقیقی مضمون میں جو کتاب میں شامل ہے ہر دو بزرگوں کی سیرت و کردار کا خوبصورتی سے جائزہ لیا ہے اور اپنی رائے بے لاگ طریق سے بیان کردی ہے ---- ماضی کی تاریخ کے حوالے سے یہ کتاب بڑی اہم ثابت ہوگی اور ہر دو بزرگوں کو سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

---

○ ہندوپاک کے فقہی مکاتب فکر اور اسلامی فرقے، ترتیب: محمد عبدالرشید ندوی
ناشر: کمپیوٹر اردو سنٹر، ندوی منزل ندوہ روڈ لکھنؤ

یہ مفید رسالہ در حقیقت پی ایچ ڈی کے ایک مقالہ کا حصہ ہے جو اسلامی یونیورسٹی ریاض دی عرب کے لئے لکھا گیا۔ اس کا عنوان تھا " چودھویں صدی کے مفسرین اور ان کی سیریں"۔ نظرِ ثانی اور مفید اضافوں کے ساتھ عربی سے اردو میں منتقل کر کے جناب محمد عبد رشید ندوی نے اسے مرتب کیا اور چھاپ دیا مستند ماخذ سے مولانا نے بتلایا ہے کہ ہندوپاک کون کون سے فقہی مکاتبِ فکر تھے اور کون کون سا اسلامی فرقہ! پھر یہاں مسلکِ حنفی کی آمد تی پر گفتگو کی گئی ہے اور احناف و اہلِ حدیث (غیر مقلد حضرات) کا تذکرہ ہے۔ اس ضمن انہوں نے اہلِ حدیث برادری سے ایک سوال ضرور کیا ہے کہ کیا اس طبقہ کا ہر فرد اس یشن میں ہے کہ وہ مسائل کا قرآن و حدیث سے براہِ راست استنباط کر سکے؟ اگر ایسا نہیں تو مسلک کے عام لوگ بھی تو کسی کے مقلد ہی ٹھہرے۔ کیا یہ رویہ تقلید کا نہیں اور کیا تقلید ائمہ اربعہ کی ہی ہے؟ باوجودیکہ مرتب کا رجحان خود ایسے ہی حضرات کی طرف ہے لیکن انہوں نے یہ چبھتا سوال کر کے سب کو چونکا دیا ہے۔ انہوں نے دیو بندی بریلوی ف کا ذکر کیا ہے اور خاص طور پر بریلوی مکتبۂ فکر کے کردار و عمل کا تجزیہ کیا ہے اور ساتھ اہلِ قرآن، منکرین حدیث اور قادیانی جماعت کا تعارف کرایا ہے۔

گو رسالہ مختصر ہے، لیکن مصروف لوگوں کے لئے اپنے اختصار و جامعیت کے سبب انتہائی ہے اور ضرورت ہے کہ ایسے رسائل بہت عام کئے جائیں تاکہ امت کے عام افراد صحیح سے آگاہ ہو سکیں۔

(محمد سعید الرحمٰن علوی)